داغ
بحیثیت مثنوی نگار
فرید پربتی

داغ بحیثیت مثنوی نگار

ڈاکٹر فرید پربتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

DAAGH BAHAISIYAT MASNAVI NIGAR

By

Dr. Fareed Parbati

Year of Edition 2010
ISBN 978-81-8223-723-0
Price Rs. 200/-

کتاب کا نام : داغ بحیثیت مثنوی نگار
مصنف : ڈاکٹر فرید پربتی
سنِ اشاعت : ۲۰۱۰ء
قیمت : ۲۰۰ روپے
کمپوزنگ : شبیر احمد (9596553650)
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

فہرست

انتساب

ادیب و ناقد برادرم
پروفیسر علی احمد فاطمی
کے نام

ایزد بترازوئِ قدر باخورشید
چوں جنس نکوئی رُخت می سنجید
ایں بسکہ گراں بود نجنبید زجا
واں بسکہ سبک بود بافلاک رسید

ابتدائیہ

اردو ادب میں داغؔ صاحبِ طرز اور مقبول ترین شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک دبستان کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ داغؔ نے اردو زبان کو نہ صرف مانجھا اور صیقل کیا بلکہ روزمرہ کے برجستہ اور بے تکلف استعمال کے امکانات کو روشن بھی کیا ہے۔ داغؔ نے غزل کے علاوہ اردو میں مروّجہ تقریباً تمام اصناف اور شعری ہیئتوں میں اپنی جدتِ طبع کے نشانات چھوڑے ہیں۔ اُن کی شہرت کا البتہ تمام تر دار و مدار غزل پر ہے۔ ایک تخلیق کار کو جب کسی ایک صنفِ شعر میں زیادہ مقبولیت مل جاتی ہے باقی اصناف، جن کو اُس نے اپنے خونِ جگر سے سیراب کیا ہوتا ہے، پرکم توجہی کی دبیز تہیں چڑھ جاتی ہیں۔ سوداؔ کی غزل، میرؔ انیس کی رباعیاں اور داغؔ کی مثنوی (فریادِ داغؔ) اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ داغؔ کی غزل کو چونکہ زبردست مقبولیت ملی جس سے ان کے دیگر اصناف پرکم توجہی کی تہیں چڑھ گئیں۔ ورنہ داغؔ جتنے اچھے غزل نگار ہیں اُتنے ہی اچھے رباعی نگار، تاریخ گو، قصیدہ نگار اور مثنوی نگار بھی ہیں۔

داغؔ کی مثنوی فریادِ داغؔ اردو ادب کی اہم ترین مثنویوں میں سے ہے۔ اس میں حسنِ بیان، لطفِ زبان، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے عمدہ نمونے موجود ہیں یہ مثنوی داغؔ نے اُس دور میں لکھی ہے جب وہ رام پور میں قیام پذیر تھے۔ یہ مثنوی حقیقی معنوں میں اُن کی سوانح کا اہم ترین باب ہے۔ اسی وجہ سے اس مثنوی میں ماورائیت کی بجائے جذبے کی صداقت، خلوص اور نشتریت پائی

جاتی ہے۔ دراصل یہ مثنوی ایسے کرداروں کے تعلقِ خاطر کی کہانی ہے جو اس زمیں پر چلتے پھرتے ہیں اور اسی فضا میں سانس لیتے ہیں جو حقیقی معنوں میں عام زندگی ہے۔ داغؔ نے اپنے فنی کمال سے اپنی سرگزشتِ عشق کو دیوؤں، پریوں یا شہزادوں اور شہزادیوں کی قیاسی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس مثنوی کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جس کی یہ مستحق ہے۔ اس کتاب کو اسی جذبے کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ تاکہ داغؔ کو پسند کرنے والے ان کی مثنوی سے بھی لطف اندوز ہوں۔

اس کتاب میں مثنوی فریادِ داغؔ کا صحیح اور معتبر متن شامل کیا گیا ہے جو دیگر مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس کے قلمی نسخوں کو بنیاد بنا کر تیار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مثنوی پر لکھے گئے چند اہم مضامین بھی اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ جن میں تمکین کاظمی کا مضمون سب سے اہم، مفصل اور اس مثنوی کی کئی جہتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان مضامین میں جو کمیاں تھیں اُن کو جدید معلومات کی روشنی میں دور کرنے کے لیے ایک نیا مضمون لکھ کر شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے اس مثنوی کی ہیروئن منی بائی حجاب کے نام داغؔ کے مطبوعہ خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ آخر میں مشکل الفاظ اور محاوروں کی ایک فرہنگ بھی دے دی گئی ہے۔

ڈاکٹر فرید پربتی

باب اول

داغؔ بحیثیت ایک مثنوی نگار

داغؔ اردو ادب میں عہد ساز اور عہد آفرین شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے اپنے فنّی اختصاص، شیوۂ گفتار اور زبان وبیان پر بے پناہ قدرت کے بل بوتے پر نہ صرف اپنے عصر کو اپنا ہم نوا بنایا بلکہ اُسے نئی سمت اور نیا رفتار بھی عطا کیا۔ اُن کا لب ولہجہ اتنا تابناک ہے کہ دور سے پہچان میں آتا ہے۔ اس میں شرینی، گھلاوٹ اور لوچ کے ساتھ تکلف، تصنع اور بناوٹ اس طرح ہم آمیز ہے کہ ایک نیا طرزِ سخن خلق ہوا ہے جس کو صحیح معنوں میں دہلی اور لکھنو کے شعری امتیازات کا خوبصورت امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ ان ہی بنیادوں پر داغؔ کو اپنے عصر کی شعری روایت کا صحیح ترجمان کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

داغؔ کے منفرد اندازِ تکلم کی پذیرائی کے سلسلے کا آغاز باضابطہ طور پر اُن کے دور ہی سے شروع ہوتا ہے۔ گلزار داغؔ جو اُن کا پہلا شعری مجموعہ تھا، کے قطعہ تاریخ میں نیر درخشاں نے اُن کی نازک خیالی اور نغز گوئی کو اس طرح خراج پیش کیا ہے۔

ناظم آن نخلبند معنی را	کہ بیار است از سخن صد باغ
گل رنگینِ باغ دل افروز	ورد خوشبوئے عطر بیز دماغ
اوجِ نازک خیالی اورا	بایدآں سوئے عرش جست سراغ
معنی نغز از دلنش ریزاں	چوں مئے ناب از کنارِ ایاغ
کردہ مشکیں غزالِ مضموں صید	صفحۂ خاطرش ختن را راغ

داغؔ نے اگر چہ اپنی تمام تخلیقی اپج غزل پر صرف کی اس کے باوجود انھوں نے اردو شاعری میں دیگر مروجہ اصناف اور شعری ہیتوں سے اغماض نہیں برتا ہے۔ بلکہ غزل کے وقیع سرمائے کے علاوہ انھوں نے دیگر اصناف میں بھی وافر ذخیرہ تخلیق کیا ہے۔ اس طرح اُن کے کلام میں قصائد، مسدس، رباعیات، مخمسات، تاریخی قطعات کا وافر ذخیرہ موجود ہے اور انہوں نے اپنی جودت طبع تقریباً تمام مروجہ اصناف اور شعری ہیتوں میں آزمائی ہے۔ داغؔ کا شہر آشوب جو مسدس کی ہیت میں ہے اتنا پُر لطف اور بھر پور ہے کہ یہ آخری معیار ٹھہرایا گیا ہے۔ البتہ اس میں دو رائے نہیں کہ اُن کا تخلیقی اور فنی رچاؤ حقیقی معنوں میں غزل کے بعد جس صنف میں سب سے زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے وہ مثنوی ہے۔

داغؔ نے صرف ایک مثنوی ''فریادِ داغؔ'' کے نام سے لکھی ہے۔ فریادِ داغؔ اس کا تاریخی نام ہے اور یہ اُن کے ایک سوانحی واقعے پر مشتمل ہے۔ بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ اُنھوں نے مزید کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں۔

> ''......قدیم شعراء کے کلام کے لیے جس طرح قلمی اور غیر مطبوعہ نسخوں کی تلاش ہوئی ہے اور اس میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوا کرتی ہے اسی طرح داغؔ کی مثنویوں کے متعلق بھی مختلف شبہات اب بھی موجود ہیں۔ ایک طبقہ ہے جس کا خیال ہے کہ داغؔ کی بہت سی مثنویاں ابھی شائع نہیں ہوسکیں اور نہ اُن کا پتہ چلتا ہے''۔[1]

حسب ذیل شواہد کی بنا پر ان شبہات کی تردید آسانی سے ہوتی ہے:۔

۱۔ داغؔ پر تحقیقی کام کرنے والوں نے اُن کے چار دواوین اور صرف ایک مثنوی کا ذکر جگہ جگہ کیا ہے اور کسی نے بھی کسی طرح کے شبہے کا اظہار نہیں کیا ہے مثلاً:

(الف) چار دیوان ان کے یادگار ہیں گلزار داغؔ، آفتاب داغؔ، مہتاب داغؔ، یادگار داغؔ آخر الذکر کا یعنی یادگار کا ایک ضمیمہ بھی ہے...... ایک مثنوی موسوم بہ فریادِ داغؔ بھی لکھی ہے۔[۲]

ب) محمد علی زیدی نے اپنی کتاب مطالعہ داغؔ میں لکھا ہے کہ ''داغؔ نے صرف ایک مثنوی فریادِ داغؔ لکھی تھی اس میں کلکتہ کی ایک طوائف منی بائی حجاب سے اپنے معاشقے کی داستان کلکتہ کے سفر سے واپسی کے بعد جولائی میں لکھی تھی''۔[۳]

۲۔ داغؔ نے ایک ضخیم دیوان ۱۸۵۷ء سے پہلے مرتب کیا تھا جو غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ اس میں جن اصناف کے نمونے موجود ہیں اُن کا ذکر شاگرد داغ احسن مارہروی داغؔ کے حوالے سے ''جلوۂ داغؔ'' میں اس طرح کرتے ہیں۔

''ابتداء مشق سے حضرت ذوقؔ کی حیات تک آپ کا (داغؔ کا) اتنا کلام جمع ہو گیا تھا جو سات جزو میں لکھا گیا تھا اور جس میں غزل، قصیدہ، قطعہ، واسوخت، رباعی، مخمس، خطوط، نظم، عرائض وغیرہ ہر صنف کا کلام موجود تھا۔ وہ دیوان کا دیوان غدر میں ایسا تباہ ہوا کہ پھر اُس کا پتہ نہ چلا''۔[۴]

۳۔ اس حوالے میں مثنوی کے سوا تقریباً تمام مروجہ اصناف کا ذکر ملتا ہے اس

طرح اِن پختہ شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ داغ نے صرف ایک مثنوی ''فریادِ داغ''، لکھی ہے۔

داغ نے یہ مثنوی سفر کلکتہ سے واپسی کے بعد لکھی ہے اور صرف دو دن کی فکر کا ثمرہ ہے۔ احسن مارہروی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریادِ داغ جیسی بے مثل مثنوی صرف دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے''۔[۵]

مثنوی فریاد داغ اپنی اشاعت کے بعد کافی مقبول ہوئی اور متعدد بار مصنف کی زندگی ہی میں زیور اشاعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ داغ اپنے ایک خط میں منی بائی حجاب کو لکھتے ہیں۔

''صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں، مکرر چھپیں گی''۔[۶]

داغ نے یہ مثنوی رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ بمطابق جولائی یا اگست ۱۸۸۱ء میں لکھی تھی مگر اس کا نام (فریادِ داغ) انھوں نے دو تین مہینہ کے بعد ماہِ محرم ۱۳۰۰ھ بمطابق نومبر ۱۸۸۲ء میں رکھا ہے۔ اس طرح فریاد داغ سے اس کی طباعت کی تاریخ نکلتی ہے نہ کہ سنہ تخلیق کیونکہ یہ مثنوی ۱۲۹۹ھ میں ہی لکھی گئی ہے۔ گیان چند جین البتہ اس کا سنہ اشاعت ۱۲/ اپریل ۱۸۸۵ء/ ۱۲۹۹ھ[۷] لکھتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ فریادِ داغ کا پہلا ایڈیشن جو محمد امجد علی مالک اخبارِ نیر اعظم مرادآباد نے اپنے مطبع، مطبع العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کیا تھا اُس میں تاریخ طباعت اس طرح درج ہے۔

گفت تسلیم سالِ طبع او — آفتِ دین فتنہ آرائی

۱۳۰۰ھ

صولت لائبریری رام پور میں یہ ایڈیشن محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی موجود ہے۔ یہ ۱۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے۔ اس کے بعد یہ مثنوی مہتاب داغ کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی اور اس میں محمد فیروز شاہ خان فیروز کی مندرجہ ذیل تاریخ طباعت بھی شامل ہے۔

وہ ہیں مضمون عالی مثنوی میں — کہ حاصل جس سے معنی کو بلندی
چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم — لکھی تاریخ "نظم دردمندی"

۱۳۰۲ھ

تیسری مرتبہ یہ مثنوی امجد علی نے مراد آباد سے ۱۳۱۳ھ میں شائع کی اس میں بھی فیروز کا قطعہ تاریخ شامل ہے۔

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع — مثنوی وہ جو روح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروز — مثنوی یہ ہے یا گل تر ہے

۱۳۱۳ھ

اس کے بعد اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۸۹۹ء اور پانچواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں نکلا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۵۶ء میں تمکین کاظمی نے اس کتاب کی نایابی کو مدِ نظر رکھ کر اسے کمرشل بک ڈپو چار مینار حیدر آباد (دکن) سے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں تمکین کاظمی دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"فریادِ داغ کی اشاعت کا ارادہ مدت سے تھا مگر میں نے مقدمہ اس پر فروری ۱۹۵۶ء میں مکمل کیا مگر اصل مرحلہ طباعت کا تھا جو

میرے بس کا روگ نہ تھا معلوم نہیں یہ مقدمہ اور مثنوی بھی میرے دوسرے مسودات کے ساتھ کب تک یوں ہی پڑے رہتے اگر محبِ مکرم جناب تصدیق حسین تاج ناشر و تاجر کتب مالک دوکان احمد حسین جعفر علی تاجر کتب و اقبال پرنٹنگ پریس چار مینار حیدر آباد دکن اس کو نہ دیکھ لیتے اور والہانہ طریقے سے اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام نہ کر دیتے''۔[8]

داغؔ نے جس وقت یہ مثنوی لکھی۔ اس وقت تک شمالی ہند کے شعراء نے کئی اہم اور مقبول مثنویاں تخلیق کی تھیں۔ سحر البیان، گلزار نسیم، میر کی مثنویاں، مومن کی مثنویاں، اپنی انفرادی خوبیوں، حسنِ بیان، لطف زبان اور ادائیگی اور سلیقہ مندی کی وجہ سے معیار کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔ ان مثنویوں کو ان کی ذیلی تفاصیل، ضمنی کہانیاں، طلسمی فضا آفرینی پُر اثر بناتی ہیں۔ البتہ ان مثنویوں پر فوق الفطری عناصر کی شمولیت سے ایک ماورائی کیفیت حاوی نظر آتی ہے۔ ان میں سے اکثر عام انسانی زندگی سے سروکار کم ہی رکھتی ہیں۔ اور یہ خواب آور دنیا کی زائیدہ نظر آتی ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم داغؔ کی مثنوی فریاد داغؔ کو دیکھتے ہیں تو قصہ پن، واقعات کی داخلی شہادتوں، کرداروں کے حرکت و عمل اور بندش الفاظ، طرز بیان اور شعری صنعتوں کے استعمال سے یہ اردو مثنوی کے سرمائے میں ایک نئی چیز نظر آتی ہے۔ یہ داغ کا کمالِ فن ہے کہ انھوں نے پہلی دفعہ اردو مثنوی کو سچ بولنا سکھایا اور اپنی سرگذشتِ عشق کو دیووں اور پریوں، یا شہزادوں اور شہزادیوں کی قیاسی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ شاید اس کے لیے انھیں کوئی شعوری

کوشش بھی نہ کرنا پڑی ہو کیونکہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی[9]۔ یہ ایک نئے انداز کی مثنوی اس لیے بھی ہے کیونکہ یہ ایسے زندہ کرداروں کی جذباتی وابستگی کی روداد ہے۔ جو گوشت پوست اور چلتے پھرتے انسانی کردار ہیں اور اپنے زمانے سماج اور سماجی قدروں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ اس کے مصنف کی سوانح عمری کا ایک معتبر باب ہے۔

مثنوی ''فریادِ داغؔ''، فصیح الملک داغؔ نے اس وقت لکھی ہے جب داغؔ مستقلاً رام پور میں قیام پذیر تھے اور نواب کلب علی خان والی رام پور کی فرمان روائی کا زمانہ تھا۔ یہ دور دراصل داغؔ کی زندگی کا سب سے زیادہ پرسکون زمانہ تھا۔ یہ مثنوی بھی دیگر مثنویوں کی طرح حسبِ روایت حمد و نعت، منقبت، فرمان روا کی مدح اور ریاست کی تعریف سے شروع کی گئی ہے ۔

حمد ہے عشق آفریں کے لیے	نعت ہے ختم مرسلیں کے لیے
السلام اے چہار یارِ کبار	السلام اے ایمۂ اطہار
مدحِ نواب نامدار کروں	جان قربان دل نثار کروں
حاجی و زائر و خدا آگاہ	شاہِ درویش خوئے ظل اللہ
وہ رئیس دلاور اخترِ ہند	وہ مخاطب مشیرِ قیصرِ ہند
قیصرِ ہند سے مشیر خطاب	اور فرزند پذیر خطاب
اُس سخی کا ہے کام دینے کا	اُس کے دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ بھرا پرا پایا	دل خزانے سے بھی بڑا پایا
سو مزے ایک بات میں دیکھے	سو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرائے رام پور رہیں	تا قیامت مرے حضور رہیں

ہے عجب شہر مصطفیٰ آباد　　اُس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اِسے رام پور کہتے ہیں　　ہم تو آرام پور کہتے ہیں

والی رام پور نواب کلب علی خان اپنے والد نواب یوسف علی خان ناظم کی طرح سخن فہم، سخن سنج اور زمانہ شناس رئیس بھی تھے انھوں نے ریاست رام پور کو قابلِ توجہ اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے نہ صرف اہم شعراء، فضلاء اور اہلِ کمال کو بلا کر انھیں اپنے یہاں ملازمتیں دیں بلکہ صنعت و حرفت کو بڑھاوا دینے کے لیے اپنی مسند نشینی کے فوراً بعد مارچ ۱۸۶۶ء میں بے نظیر کا میلہ بھی شروع کروایا۔ اُس وقت داغؔ کی عمر ۳۵ سال تھی یہ میلہ ماہِ مارچ کے آخری ہفتے میں شروع ہوتا اور ختم مہینے پر ختم ہو جاتا مگر کبھی کبھار اِسے اپریل کے پہلے ہفتے تک بھی توسیع دی جاتی یہ میلہ ایک باغ میں لگتا تھا جس کا نام بے نظیر تھا۔ اسی مناسبت سے اس کو بے نظیر کا میلہ کہا جاتا تھا۔ اس میلے میں پورے ہندوستان سے بیوپاری مال لاتے تھے اور نواب صاحب اس میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ بقول داغؔ

حالِ فردوس سن لیا واعظ　　وہ بھی کیا بے نظیر باغ ہوا

اس میلے کا ذکر اُس دور کے رام پور میں قیام پذیر اکثر و بیشتر شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً داغؔ، امیرؔ مینائی اور جانؔ صاحب کے یہاں ضرور ملتا ہے۔ مگر داغؔ نے اس میلے کو ایک اور ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس انداز سے بے نظیر کے میلے کی تشہیر کی جاتی تھی اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پس پشت ایک ہی مقصد کار فرما تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کا فروغ اس سلسلے میں داغؔ کی مثنوی بھی ایک تشہیری پہلو رکھتی ہے۔

مثنوی فریاد داغؔ پلاٹ، کردار، تسلسل بیان، ربط کلام اور جزئیات نگاری

کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کی مثنوی ہے اور یہ میر حسن، میر تقی میر، شوق لکھنوی یا نسیم کی مثنویوں سے کسی طرح کم پایہ مثنوی نہیں ہے۔ البتہ ان مثنوی نگاروں اور داغؔ کی مثنوی میں ایک بڑا اور واضح فرق یہ ہے کہ داغؔ کی مثنوی چونکہ ذاتی واردات پر مشتمل ہے اس وجہ سے اس میں سلاستِ بیان، بے ساختہ پن اور بھرپور داخلیت ہے اور خارجی عناصر کا دخول کم سے کم ہے اس کے باوجود مثنوی ایک بیانیہ صنفِ سخن ہے۔ مثنوی فریادِ داغؔ کے برعکس سحر البیان اور گلزار نسیم میں خارجی عناصر کا وفور ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں مثنویوں میں شیوۂ گفتار کو موثر بنانے کے لیے داستانوی تحیر خیزی پیدا کرنے کی بھی شعوری کوششیں کی گئی ہیں اور اسی وجہ سے ان میں مافوق الفطری عناصر بھی داخل ہوئے ہیں۔ اس مثنوی کا پلاٹ چونکہ داغؔ کی ذاتی زندگی کے ایک رومانی واقعے پر مشتمل ہے اسی وجہ سے اس میں ماورائیت کی بجائے خلوص، صداقت اور ارضیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔ ''داستانی مثنویوں کا ہیرو مخالف قوتوں کو روندتا کچلتا کامرانی کی جانب بڑھتا جاتا ہے لیکن خالص وارداتِ عشق کی مثنویوں کا ہیرو مخالف قوتوں کا شکار ہو کر جان سے گزر جاتا ہے''[1]۔ جب ہم اس تناظر میں فریادِ داغؔ کے مرکزی کردار کو دیکھتے ہیں وہ داستانی مثنوی کے ہیرو کی طرح باقوت ضرور ہے مگر اس کے باوجود اُس پر بشری عناصر غالب ہیں۔ وہ چالاک اور چالیا ضرور ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے دشمنوں کو زیر کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ ہر جگہ وضع داری اور ناموس کا بھی پاس رکھتے ہیں۔ داغؔ کی زندگی سے واقفیت رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ داغؔ رجائی تھے اسی وجہ سے ان کا تصورِ عشق بھی حرکی پہلو رکھتا ہے وہ

۱۔ تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا　　داغؔ ہے چالیا زمانے کا

دور بین اور دور اندیش بھی تھے۔

داغ نے ہمیشہ زندگی میں محتاط رویہ اور میانہ روی اپنائی ہے۔ یہ باتیں نہ صرف اُن کے خطوط میں موجود ہیں بلکہ مثنوی فریادِ داغ کے اکثر اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔

اس طرح کا فہیم و فرزانہ ۔۔۔ اے تری شان یوں ہو دیوانہ
اس کے قابو سے دل نکل جائے ۔۔۔ ہے غضب اس پہ چال چل جائے
یہ ہر اک فن سے خوب واقف تھا ۔۔۔ دوست دشمن سے خوب واقف تھا
ہم سمجھتے تھے ہوشیار اُسے ۔۔۔ عشق میں آزمودہ کارِ اسے

مثنوی فریادِ داغ فصیح الملک داغ کی ذات کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں داغ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ صاف نظر آتے ہیں وہ ہر تخلیق کار کی طرح اپنی تخلیقات میں بھرپور انداز میں سامنے آتے ہیں۔ داغ نے زندگی میں کبھی ماورائی یا فوق البشر بننے کی کوشش نہیں کی ہے جس طرح ان کی زندگی تکلّفات سے عاری تھی اسی طرح ان کی تخلیقی زندگی بھی تکلّفات اور تصنوعات سے خالی تھی۔

اس طرح کس طرح سے رہ جاتے ۔۔۔ ہوئے باؤں برس نمک کھاتے
دل خدا نے دیا غیور بہت ۔۔۔ تھا یہ پاس نمک سے دور بہت
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے ۔۔۔ تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے
یہ شرافت کا مقتضا ہی نہیں ۔۔۔ کہ شریفوں سے یہ ہوا ہی نہیں
کب میسر ہو روزگار ایسا ۔۔۔ اور آقائے نامدار ایسا
کچھ تمنا نہیں رہی مجھ کو ۔۔۔ کونسی شئے کی ہے کمی مجھ کو

داغ کے یہاں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے عشق کا حرکی پہلو نظر آتا

ہے۔ دراصل ان کی زندگی کی لغت میں ناکامی کا لفظ آیا ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ ان کی پوری شاعری کی طرح مثنوی فریاد داغ میں بھی زبان و بیان کے حسن کے ساتھ ساتھ جمالیاتی کیف واثر سے بھی قدم قدم پر سامنا ہوجاتا ہے۔ مثنوی فریاد داغ سے پہلے کی شمالی ہند کی مثنویوں میں عموی طور جنسی تلذ ذ اور حرکت کی بجائے جمود کے آثار ملتے ہیں۔ مثلاً

محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد	دلوں میں محبت سے اُٹھتے ہیں درد
گیا قیس ناشاد اس عشق میں	کھپی جانِ فرہاد اس عشق میں
ہوئی اس سے شریں کی حالت تباہ	کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ
سنا ہوگا وامق یہ جو کچھ ہوا	نل اعشق میں کس طرح سے موا

شعلۂ عشق (میر تقی میر)

داغ کی شاعری میں جوایک نوع کا تیور نظر آتا ہے دراصل اس کی بنیاد ان کے تصور عشق پر ہے۔ جوحرکت سے پُر ہے ان کی غزلیہ شاعری میں یہ چیزیں بطور خاص ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ حسبِ ذیل اشعار سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

وہ صراطِ عشق میں اے داغ ہوں ثابت قدم
مشق کی ہو جس نے رکھ کر تیغ و خنجر زیر پا

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈال دیا

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارہ ہم کو
جا کے دنیا میں نہ آتا ہے دوبارہ ہم کو

بحوالہ بالا اشعار سے اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ تصورِ عشق کا یہ پہلو ان کی غزلیہ شاعری میں پہلے سے موجود ہے البتہ فریادِ داغؔ میں زیادہ گاڑھا نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر یہ مثنوی میرؔ، مومنؔ، اثرؔ اور شوقؔ کی مثنویوں سے کافی منفرد اور کافی اہمیت کی حامل مثنوی ہے۔

اس سے دل کا چراغ روشن ہے
آنکھ روشن دماغ روشن ہے

مثنوی فریادِ داغؔ جس طرح ان کے تصورِ عشق کی پرتیں کھولتی ہیں اسی طرح یہ مثنوی ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجالنے میں مدد دیتی ہے۔ داغؔ پُر اعتماد اور خود آگاہ تخلیق کار تھا۔ انھوں نے شعر و ادب کا وہ دور پایا تھا جس میں مومنؔ، غالبؔ، جان محمد عیشؔ جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد ان میں سے کسی کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا اور اسی فنی شعور اور مخصوص نظریہ فن پر آخیر تک قائم و دائم رہے جو انھیں ذوقؔ سے حاصل ہوا تھا۔ اس خود اعتمادی نے ان کے رنگِ سخن کو نہ صرف تابناک بنا دیا بلکہ دوسروں کو بھی متوجہ کر دیا۔ غالبؔ کے اہم شاگرد میر مہدی مجروحؔ کی شاعری غالبؔ کے زیرِ اثر پروان ضرور چڑھی اس کے باوجود اس کا رنگ سخن داغؔ سے زیادہ قریب ہے اس خود اعتمادی اور خود آگہی کا اظہار ان کی غزلوں کے علاوہ اس مثنوی میں بھی نظر آتا ہے۔

تازگی بخش نامِ ذوق و نصیر   رشکِ سودا و درد، مومن و میر
اے سخن گوئے عیسوی اعجاز   اے سخن سنج سامری انداز

داغؔ کی یہ مثنوی ان کے مزاج، طرزِ معاشرت اور پوری زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں داغؔ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پورے طور سے نظر

آتے ہیں۔ داغؔ کا سوانح نگار اور روز نامچہ نویس جہاں خاموش نظر آتا ہے وہاں پر اس مثنوی کے اشعار بولنے لگتے ہیں۔ داغؔ کے سوانح نگار عام طور پر لکھتے ہیں وہ خوب رو اور خوش شکل نہیں تھے اور سیاہ رنگت کے تھے ان کی غزلوں میں بھی اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

دیکھ کر داغؔ کو وہ کہتے ہیں ایسی صورت سے پیار کون کرے

مثنوی فریاد داغؔ میں داغؔ نے اپنی سیرت اور صورت کا ایک ایسا پر لطف اور مکمل خاکہ کھینچا ہے جس کے ذریعے سے داغؔ کی صورت اور سیرت مکمل طور پر سامنے آتی ہیں۔ اس خاکے کے بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

''اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی اور روانی وعمدگی ان کی قابلِ داد ہے علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا''۔[11]

اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ سے ایک تسامح ہوا ہے دراصل تخاطب معشوق کی تصویر سے نہیں ہے بلکہ عاشق کی تصویر سے ہے یہ بیانیہ شاعری کی ایک منفرد مثال ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یہ سنا ہے کہ وہ پری پیکر یاد کرتا ہے مجھ کو یوں اکثر
میری تصویر رکھ کے پیش نظر کوسنا چھیڑنا یہ کہہ کہہ کر
اِس ڈھٹائی سے تو ادھر دیکھے آنکھیں پھوٹیں ہمیں اگر دیکھیں
کس طرح گھورتا ہے بلے شریر جی میں آتا ہے پھونکدوں تصویر
تو ہمیں رات دن رلاؤں تجھے دیکھنے کا مزا چکھاؤں تجھے

ایسی صورت پہ یہ دماغ ترا — خوب رکھا ہے نام داغ ترا
حسن ہوتا ہے حاصلِ تصویر — روسیہ تو ہے قابلِ تصویر
شکل منحوس کیوں نظر آئے — مول کے کر بھی ہم تو پچھتائے
ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے — پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے
تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لیے — رکھ لیا ہے نظر گزر کے لیے

اس مثنوی کو جہاں اردو ادب میں بہت سراہا گیا ہے وہیں اس پر لکھنے والوں نے اس کے کچھ اشعار کو مبتذل ٹھہرایا ہے۔اس سلسلے میں رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں:

”بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں“۔[12]

مثنوی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات الم نشرح ہوتی ہے کہ لطف زبان اور حسن بیان کے ساتھ ساتھ اس میں متانت اور سنجیدگی بھی بدرجہ اُتم موجود ہے اس سلسلے میں گیان چند جین کی یہ رائے کافی اہمیت رکھتی ہے کہ:

”فریاد داغ دلی کی آخری مشہور مثنوی ہے زبان، بیان اور جذبات کے لحاظ سے یہ حکیم شوق کی مثنویوں کے قریب آجاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں بے حیائی سے کام نہیں لیا گیا ہے“۔[13]

داغ نے اس مثنوی میں ہر جگہ احتیاط کا دامن پکڑ کے رکھا ہے یہاں تک کہ وصل کی کیفیت بیان کرنے میں بھی بڑا ہی محتاط رویہ اپنایا ہے۔

صبح سے شام تک جمال کے لطف — شام سے صبح تک وصال کے لطف

غم کی راتیں نہ تھے ملال کے دن		کیا پھرے تھے شبِ وصال کے دن
وصل کے شب میں جلوے تھے دن کے		سرمہ تھے خلق میں موذن کے
عیش و عشرت کی بات بات اچھی		رات سے دن تو دن سے رات اچھی
محفلِ عیش کا بندھا وہ سماں		دیکھے پھر پھر کے جس کو عمرِ رواں
دوستوں سے بھری پڑی محفل		چشم بد دور وہ پری محفل
بزم آرا تھے سب عدو کے سوا		کوئی نکلا نہ آرزو کے سوا
میری محفل میں دخل غیر کہاں		غیر ہو جس جگہ تو خیر کہاں

اس مثنوی میں داغ نے منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں اور اردو کے عام مثنوی نگاروں کی طرح اپنے بیان کو زیادہ سے زیادہ تاثر کن بنانے کے لیے اطراف و جوانب کے مناظر کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنے پر زیادہ سے زیادہ زور دیتا ہے یہ مثنوی بھی ان باتوں سے خالی نہیں ہے۔

کیا قیامت تھی شہر کی گرمی		کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ عاری ہو		جائے نوری وہاں تو ناری ہو
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے		عنصرِ آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل		جل گئے بے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنور طوفاں بھی		کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی

اس طرح فریاد داغ اپنے شعری محاسن، لطف زبان، حسن بیان، واقعہ نگاری، تسلسل بیان، جذبات نگاری کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کی مثنوی ہے۔ جس طرح داغ نے اپنی غزلوں کے منفرد لب ولہجہ اور اسلوب سے نہ صرف اپنے دور کو بلکہ پوری اردو شاعری کو متاثر کیا اسی طرح انھوں نے فریاد داغ جیسی معرکتہ الآراء مثنوی لکھ کر مثنوی نگاری میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔

حواشی

۱۔	اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں	سید محمد عقیل رضوی ص:۱۸۷
۲۔	تاریخ ادب اردو (مترجم)	رام بابو سکسینہ ص:۳۶۹
۳۔	مطالعہ داغؔ	محمد علی زیدی ص:۲۳۱
۴۔	جلوۂ داغؔ	احسن مارہروی ص:۱۱۱
۵۔	جلوۂ داغؔ	احسن مارہروی ص:۱۱۱
۶۔	زبان داغؔ	رفیق مارہروی ص:۱۹۰
۷۔	اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اول)	گیان چند جین ص:۲۵۹
۸۔	معاشقۂ داغؔ و حجاب مع فریاد داغؔ	تمکین کاظمی ص:۲
۹۔	معاشقۂ داغؔ و حجاب مع فریاد داغؔ	تمکین کاظمی ص:۲
۱۰۔	فکر و تحقیق (داغؔ نمبر)	ص:۷
۱۱۔	اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اول)	گیان چند جین ص:۴۲۲
۱۲۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ ص:۳۷۰
۱۳۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ ص:۳۶۲

فریادِ داغؔ

سنہ ۱۳۰۰ھ

(متن)

حمد ہے عشق آفریں کے لیے نعت ہے ختم مرسلیںؐ کے لیے
السّلام اے چہار یار کبار السّلام اے ایمۂ اطہار
مدحِ نواب[1] نامدار کروں جان قربان دل نثار کروں
حاجی و زائر و خدا آگاہ شاہِ درویش خوئے ظلِ اللہ
وہ رئیس دلاور اخترِ ہند وہ مخاطب مشیرِ قیصرِ ہند
قیصرِ ہند سے مشیر خطاب اور فرزند دلپزیر خطاب
اُس سخی کا ہے کام دینے کا اُس کے دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ بھرا پُرا پایا دل خزانے سے بھی بڑا پایا
سو مزے ایک بات میں دیکھے سو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرائے رام پور رہیں تا قیامت مرے حضور رہیں
ہے عجب شہر مصطفیٰ آباد اُس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اِسے رام پور کہتے ہیں ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

13

۱۔ نواب کلب علی خان (نواب رام پور)

عشق کی تعریف

خوبیاں عشق کی بیان کروں　　کچھ طبیعت کا امتحان کروں

سب نے کی ہیں برائیاں اس کی　　میں نے لکھی بھلائیاں اس کی

دل بنا ہے اسی مزے کے لیے　　میں نے یہ لطف جان دے کے لیے

عشق تاب و توانِ عاشق ہے　　شانِ عاشق نشانِ عاشق ہے

عشق ہی آرزوئے عاشق ہے　　آرزو آبروئے عاشق ہے

عشق نعمت ہے آدمی کے لیے　　عشق جنت ہے آدمی کے لیے

دل اسی سے جوان رہتا ہے　　مرمٹوں کا نشان رہتا ہے

عشق کا داغ غیرتِ گل ہے　　دودِ فریاد رشکِ سنبل ہے

عشق کیا کیا بہار دیتا ہے　　یہ دلوں کو اُبھار دیتا ہے

بزدلوں کو دلیر کرتا ہے　　یہ دلیروں کو شیر کرتا ہے

عشق پر کس کا زور چلتا ہے　　اس سے رستم کا دم نکلتا ہے۔

خاک سے عشق پاک کرتا ہے　　زندہ وہ ہے جو اس پہ مرتا ہے

شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں　　جو نکمے ہیں ان کا کام نہیں

اس سے گمنام نام پاتے ہیں　　اس سے ناکام کام پاتے ہیں

یوں ہو مشہور قیس سا قلاش　　یوں ہو مشہور ایک سنگ تراش

عشق کے نام پر نثار ہوں میں　　اس کے انجام پر نثار ہوں میں

عشق کا دردِ راحتِ جاں ہے　　عشق کا زہر آبِ حیواں ہے

یہ ہے ٹکسال نقد جاں کے لیے　　یہ کسوٹی ہے امتحاں کے لیے

اس سے دل کا چراغ روشن ہے
آنکھ روشن دماغ روشن ہے
عشق سے رہتی ہے طبیعت گرم
شعلہ رویوں کے ساتھ صحبت گرم
عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہیں
سو پری زاد ہم اکیلے ہیں
عشق کے لطف ہم نے پائے ہیں
کیا کہیں کیا مزے اُڑائے ہیں
عشق سے دل گداز ہوتا ہے
ناز میں بھی نیاز ہوتا ہے
سو دوائیں ہیں اک کسک اس کی
سو ادائیں ہیں اک لٹک اس کی
یہ ہے معشوق نوجوانوں کا
یہ ہے محبوب راز دانوں کا
عشق سے آدمیت آتی ہے
آدمی کو مروّت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے
عشق سانچے میں ڈھال دیتا ہے
ہے معلم ہزار مجنوں کا
سبق آموز ہے فلاطوں کا
عشق کا لطف زندگانی ہے
زندگی کا مزا جوانی ہے
عشق عاشق کو بخشواتا ہے
عشق جنّت میں لیکے جاتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے
یہ مری جان ہے خدا رکھے
عشق باطن ہے عشق ظاہر ہے
اس سے توبہ کرے تو کافر ہے
نالۂ عشق نغمۂ نے ہے
اثر عشق نشۂ مئے ہے
اس سے دل کو سرور ہوتا ہے
اس سے نشے میں چور ہوتا ہے

ساقی نامہ

ساقیا میں اگر دعا مانگوں!
تو بجز مئے کے اور کیا مانگوں!

یہ دعا اور کامیاب نہ ہو؟
یہ دعا اور مستجاب نہ ہو؟

یہ دعائیں قبول ہوجائیں!
پارسائی کے پھول ہوجائیں!

منہ سے نالے اگر نکالوں میں!
خم گردوں کو چھید ڈالوں میں!

درد مئے سطح خاک یکسر ہو
کرۂ نار آتش تر ہو!

موجزن ہو وہ بادۂ گلگوں
بط مئے کی طرح پھرے گردوں

خم گردوں سے آئے چھن کے شراب
ساقی مئے ہو چادرِ مہتاب

خم مئے آسمان ہوجائے
میکدہ ہر مکان ہوجائے

نمکِ شور قند کا ہو جواب
سر کے پر ہو یقین بادۂ ناب

کاسۂ مئے حباب ہوجائے
آبِ قلزم شراب ہوجائے

درِ انور بسانِ ساغر ہو
ہالۂ مہ دہانِ ساغر ہو

ساغر بادہ اخترِ تاباں
بیل انگور کی ہو کاہکشاں

گل میں ہو رنگ ساغرِ مل کا
شور قلقل ہو نالہ بلبل کا

گریۂ شمع بھی ہو مستانہ
گرے مستوں کی طرح پروانہ

محتسب شوق سے ہو مے آشام
لب قاضی پہ والشربو ہو مدام

رات دن شغل مے پرستی ہو
ساری دنیا اور مستی ہو

مردمِ دیدہ تک شرابی ہو
آنکھ پیدا ہو تو گلابی ہو

خوف کیسا کہاں کی بے ادبی
انتہا کی ہے مجھ کو تشنہ لبی

کس کو اندیشہ گنہگاری — اور ہی شے ہے رحمت باری

مئے گلفام کے مزے لوٹیں — ساغر و جام کے مزے لوٹیں

اس پری کی ہے حور کی صورت — ہے یہی نار، نور کی صورت

وہ ہیں مستِ شراب کی باتیں — کھولدے سو حجاب کی باتیں

22/69

عشق کی ابتداء

دوستو! حالِ غم کہوں نہ کہوں — ماجرائے ستم کہوں نہ کہوں

مختصر واردات کہتا ہوں — سو کی میں ایک بات کہتا ہوں

مدّتوں میں نے خونِ دل کھایا — دل لگانے کا خوب پھل پایا

ان بتوں کو نہ مانتا تھا میں — ان کو پتھر کا جانتا تھا میں

دل ستایا ہوا ہزاروں کا — داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

خوب تکلیف عشق پائے ہوئے — بےوفاؤں سے رنج اٹھائے ہوئے

نہ بٹھاؤں پری کو صحبت میں — حور ہو تو نہ جاؤں جنت میں

عشق کے دام سے رہائی تھی — پارسائی سی پارسائی تھی

چپکے چپکے نہ شب کو روتے تھے — چین سے اپنی نیند سوتے تھے

طبع بشاش تھی ملال نہ تھا — کسی محبوب کا خیال نہ تھا

اب کسی سے نہ دل لگائینگے ہم — عہد پر عہد تھا قسم پہ قسم

دل لگی سے رہا بدل انکار — لاکھ توبہ ہزار استغفار

اِن بتوں سے مجھے بچائے خدا — حاصلِ دیں نہ حاصلِ دنیا

ان بتوں کو مری بلا چاہے
میں نہ چاہوں اگر خدا چاہے

توبہ کرلی پیام سے میں نے
ہاتھ اٹھایا سلام سے میں نے

اس پیام و سلام سے نفرت
تھی محبت کے نام سے نفرت

گو طبیعت تو گدگداتی تھی
پر کسی سے نہ میل کھاتی تھی

آگ لگ جائے اس محبت کو
چھیڑ کی دیر تھی طبیعت کو

عشق مدت سے تھا جو ناپیدا
اس نے پر ولولہ کیا پیدا

بجھ گیا تھا چراغِ رسوائی
پھر ہوا تازہ داغ رسوائی

موت کی شکل پھر نظر آئی
چوٹ مدت کی پھر اُبھر آئی

پھر ہوئیں دل میں حسرتیں آباد
نالے دینے لگے مبارکباد

پھر ہوا شوق جبہہ سائی کا
پھر جما رنگ آشنائی کا

صبر یاروں کا یار تھا نہ رہا
جبر پر اختیار تھا نہ رہا

آتش غم سے داغ بھنتا تھا
کون اس دل جلے کی سنتا تھا

نہیں چھٹتی ہے لاگ الفت کی
نہیں بجھتی ہے آگ الفت کی

دل کو یہ لاگ چاک کرتی ہے
دل کو یہ آگ خاک کرتی ہے

آہ سے بھی شرر برستے ہیں
نفسِ سرد کو ترستے ہیں

کیا ٹھکانا ہے آتشِ غم کا
سینہ اک طبقہ ہے جہنم کا

سوز پنہاں سے جان جلتی ہے
اُف کئے سے زبان جلتی ہے

خانۂ دل میں داغ روشن ہے
رات دن یہ چراغ روشن ہے

ہے قیامت کا سوزِ داغ جگر
نار دوزخ ہے جس کی خاکستر

لب پہ ہر دم جلے بھنے نالے
پڑ گئے ہیں زبان پر چھالے

جل گیا جب کسی سے بولے ہم
پھوڑتے ہیں جلے پھپھولے ہم

حسرت آتی ہے اپنی حالت پر
پڑیں پتھر بتوں کی چاہت پر

اب وہ دکھ درد روز بھرتا ہوں
اس زمانے کو یاد کرتا ہوں

36
105

پہلا آمنا سامنا

آ گیا بے نظیر کا میلا
دلِ پابند وضع کھل کھیلا

آفتِ جانِ ناتواں دیکھی
یک بیک مرگ ناگہاں دیکھی

جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا
سامنا ہوگیا قیامت کا

دیکھ کر اس پری شمائل کو
رہ گیا تھام تھام کر دل کو

دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا
آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا

رنگ چہرہ سے اُڑ گیا کوسوں
دل سے میں مجھ سے دل جدا کوسوں

آبرو کا لحاظ و پاس کسے
ہوش میں آؤں یہ حواس کسے

یار و غم خوار مونس و ہمدم
کہہ رہے تھے تجھے خدا کی قسم

داغؔ! تو ماجرا بیان تو کر!
تجھ کو کیا ہوگیا بیان تو کر!

کیوں ہے ایسا اداس خیر تو ہے!
کیوں اڑے ہیں حواس خیر تو ہے!

سوچو اپنا برا بھلا دیکھو؟
دیکھو نواب میرزا! دیکھو؟

شمع ساں جسم زار گھلتا تھا
پر کسی پر نہ بھید کھلتا تھا

جستجو میں بڑے بڑے عیار
نہ ہوا کوئی واقفِ اسرار

ہمنشیں و ندیم مضطر تھے
سب طبیب و حکیم مضطر تھے

رنج سا رنج تھا حسینوں کو ... داغ سا داغ مہ جبینوں کو

منہ پہ ہراک کے اشک بہتے تھے ... ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے

اس طرح کا فہیم و فرزانہ ... اے تری شان! یوں ہو دیوانہ!

اس کا قابو سے دل نکل جائے ... ہے غضب اس پہ چال چل جائے

یہ ہراک فن سے خوب واقف تھا ... دوست دشمن سے خوب واقف تھا

ہم سمجھتے تھے ہوشیار اسے ... عشق میں آزمودہ کار اسے

سینکڑوں رنگ اس نے برتے تھے ... نام سے اس کے عشق کرتے تھے

یہ وفا دار یہ خجستہ شعار ... صادق القول صادق الاقرار

کس نے بیہوش کردیا اس کو ... کس نے خاموش کردیا اس کو

کہیں آئی ہوئی طبیعت ہے ... چوٹ کھائی ہوئی طبیعت ہے

اک نظر دیکھ بھال کر کوئی ... لے گیا دل نکال کر کوئی

حال کیسا بدل گیا اس کا ... کیا کلیجہ نکل گیا اس کا

صلح کل ہے یہ آدمیت میں ... خیر سے شر نہیں طبیعت میں

خوش بیاں خوش زباں کہاں ایسا؟ ... فخر ہندوستاں کہاں ایسا؟

کس دغا باز نے اسے مارا؟ ... کس فسوں ساز نے اُسے مارا؟

کس قیامت نے پائمال کیا؟ ... سحر بنگالہ نے حلال کیا؟

وہ پری چہرہ کیا قیامت ہے ... داغؔ سے شخص کی یہ حالت ہے

اس بلا سے نکالنا اس کو ... یا الٰہی! سنبھالنا اس کو!

معشوقہ کی تعریف

مجھ کو اس حال پر نظر ہی نہ تھی دین و دنیا کی کچھ خبر ہی نہ تھی
عشق نے تازہ روپ بدلا تھا میں بھی میلے میں اک تماشا تھا
میلے والوں میں دھوم تھی میری خوش جمالوں میں دھوم تھی میری
ہوش آیا تو میں نے کیا دیکھا؟ اک پری چہرہ خوش ادا دیکھا
رُخ سے ظاہر تھا نور کا عالم اور اس پر غرور کا عالم
جُتی جُتی بھوؤں کی وہ تحریر کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر
چشمِ خوں ریز وہ فساد انگیز جس کا شاگرد فتنۂ چنگیز
گردن اس کی ہے وہ صراحی دار ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار
ایسے پتھر وہ دونوں قُبۂ نور شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
نگہِ مست ہوش یاری سے لڑنے والی چھری کٹاری سے
لب پاں خوردہ پرمسی کی دھڑی دلِ بیمار پر تھی رات کڑی
جوش پر بادۂ جوانی ہے یہی چاہِ ذقن کا پانی ہے
سج دھج آفت غضب تراش خراش کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
وہ اٹکتی ہوئی نظر آہا وہ لچکتی ہوئی کمر آہا
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی لن ترانی جواب میں کیسی
اُف رے عہد شباب کی مستی بے پیے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ ہائے تیرا خرام مستانہ

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
اِدھر آنا اُدھر نکل جانا

کبھی منہ پر نقاب کاکل ہے
کبھی منہ پھیر کر تغافل ہے

کبھی سائے سے اپنے ڈر جانا
کبھی کچھ بانکپن بھی کر جانا

آئینے سے نگاہیں لڑتی ہیں
خود بخود چتونیں بگڑتی ہیں

کبھی کچھ تیوری میں بل دینا
کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

آئینے سے نظر چرا جانا
آپ اپنے سے شرم کھا جانا

اپنے سائے سے پوچھنا تو کون؟
ہے مرے ساتھ دوسرا تو کون؟

بھولے پن میں ہزار گھاتیں ہیں
اک خموشی میں لاکھ باتیں ہیں

ہے نرالی ادا زمانے سے
روٹھنا اور بھی منانے سے

اک قیامت کی چال چل جانا
دل چھلاوے کی طرح چھل جانا

ہر کسی کو نظر میں رکھ لینا
خوب کھوٹا کھرا پرکھ لینا

دل کو نظروں میں تول لیتے ہیں
مشتری کو وہ مول لیتے ہیں

حسن کی آن بان ہائے غضب
بے نیازی کی شان ہائے غضب

ناز جلوے دکھائے جاتا ہے
حسن چہرے پہ چھائے جاتا ہے

رقصِ طاؤس باغ سے اچھا
شعر کا لطف داغ سے اچھا

جس طرف اُٹھ گئی وہ شوخ نگاہ
شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ

ادھر اظہار درد و رنج و فراق
اور اُدھر گفتگو تراق پراق

کہہ دیا دل کا حال باتوں میں
نہ رہا کچھ خیال باتوں میں

نرم باتیں کبھی نزاکت سے
گرم فقرے کبھی شرارت سے

مفت دل لے کے نقدِ جاں لینا
باتوں باتوں میں امتحاں لینا

دل صفائی سے آشنا ہی نہیں
بدگمانی کی انتہا ہی نہیں

جانب در جو بھول کر دیکھا
اُس کو تھا وہم کیوں ادھر دیکھا

کیا ہوا ایسے سے وصل کی تدبیر
جو نہ دے میرے خواب کی تعبیر

سادگی میں بناوٹیں کیا کیا
اکھڑی اکھڑی لگاوٹیں کیا کیا

شعبدے لاکھ لاکھ آفت کے
فقرے چلتے ہوئے قیامت کے

کچھ اشاروں سے مدعا کہنا
منہ ہی منہ میں برا بھلا کہنا

بھولی بھولی وہ پیار کی باتیں
شوخیاں اختیار کی باتیں

کبھی چبھتی ہوئی سنا دینا
سن کے تعریف مسکرا دینا

سخنِ ناصواب کہہ دینا
مجھ کو خانہ خراب کہہ دینا

کبھی دھمکی یہ دی کہ سمجھیں گے
کبھی گردن ہلی کہ سمجھیں گے

مفت الزام میرے سر دھرنا
بے خطا بے قصور لے مرنا

وعدہ کرتے ہی مسکرا دینا
چٹکیوں میں مجھے اُڑا دینا

سینکڑوں بات بات میں گھاتیں
میٹھی چھریاں وہ رس بھری باتیں

پتلے ہونٹوں میں کچھ تبسّم بھی
مجھ کو کہنا کہ قہر ہو تم بھی

ہائے وہ قدر دانیاں اس کی
ہائے وہ مہربانیاں اس کی

ایک اک دم میں سو مدا راتیں
لطف کے دن وہ عیش کی راتیں

ہر کسی سے اک التفات کی بات
لطف کا لطف اور بات کی بات

سو اگر ہیں کسی سے کام نہیں
پر کوئی شاکیِ کلام نہیں

وضع کے ہو خلاف کیا مقدور
ایک سے لاکھ تک نہیں منظور

لوگ جو انجمن میں آتے تھے
پھلے پھولے چمن میں آتے تھے

سن کے اس خوش کلام کی تقریر سب کو حیرت تھی صورتِ تصویر
دیکھ کر اس کے روئے انور کو آئے بیٹھے اٹھے، گئے گھر کو
کبھی شعر و سخن کا چرچا تھا کبھی اپنے وطن کا چرچا تھا
رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا ہوتی رہتی کھلی دلی کیا کیا
جاں نوازی پر اس کو ناز بھی تھا بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا
خانۂ دوست عیش خانہ تھا ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا
ستم و جور کا گلا کیجئے لطف قاتل بنے تو کیا کیجئے
شکوہ ہوتا ہے خود پسندوں سے کیا شکایت نیاز مندوں سے
کون کہتا ہے ناز نے مارا مجھ کو اس کے نیاز نے مارا
دیکھ کر یہ ادائیں آنکھوں سے کیوں نہ لوں میں بلائیں آنکھوں سے
آسماں صدقے ہونے والوں میں فتنۂ حشر پائمالوں میں
یہی انداز قہر کرتے ہیں آدمی کیا؟ فرشتے مرتے ہیں!
ایسے پھندے سے دل ہوگیا آزاد یاد آیا ہے مطلعِ استاد
خوب روکا شکایتوں سے مجھے اس[1] نے مارا عنایتوں سے مجھے
وہ بھلے جو جفائیں کرتے ہیں وہ برے جو وفائیں کرتے ہیں
دل پھنسا ہے وفا کے پھندے میں آ گیا کس بلا کے پھندے میں
عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا چار دن شادماں نہ دیکھ سکا
گردشِ روز گار اور ہوئی شکل لیل و نہار اور ہوئی

37
213

ا۔ تو۔کلیاتِ ذوق

معشوقہ کی روانگی

آ گئی ہجر کی گھڑی سر پر
یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر

اس کے لب پر پیام رخصت کا
میرے دل میں مقام حسرت کا

قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا
رنگ بدلا نیا زمانے کا

حسرت آلود وہ نگاہیں تھیں
شرر آمیز میری آہیں تھیں

بات دل کی نہ لب تک آتی تھی
فکر میں آئی عقل جاتی تھی

مثل کاکل مجھے پریشانی
شکل تصویر اس کو حیرانی

سن کے رخصت کا نام روتے تھے
سب وہاں خاص وعام روتے تھے

ٹھہرے عہد وفا جو آپس میں
کھائیں باہم ہزار ہا قسمیں

رسم الفت کے ہوگئے اقرار
خط کتابت کے ہوگئے اقرار

شکر مہر و وفا کیا میں نے
بخشوایا کہا سنا میں نے

گو یا بندہ وفا کا بندہ ہے
آدمی پھر خطا کا بندہ ہے

اس نے مجھ سے کہا یقیں مانو!
اک سر مو نہ فرق تم جانو!

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو
پر چلے ہیں قلق اٹھانے کو

ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں
اس کا واللہ کچھ خیال نہیں

زر سے معمور ہے ہمارا شہر!
کونسا دوسرا ہے ایسا شہر؟

ہے حکومت کی شان کلکتہ
سلطنت کا نشان کلکتہ

انتخاب زماں کلکتہ
فخر ہندوستان کلکتہ

ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے
آدمیت کے ساتھ الفت کے

ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا — داغؔ سا آدمی نہیں ملتا
میری تسکیں اسے کئے ہی بنی — یہ تسلّی مجھے دئے ہی بنی
آتے جاتے ہیں سب خدائی میں — مر نہ جانا مری جدائی میں
جان سی چیز یوں نہیں کھوتے! — اس قدر پھوٹ کر نہیں روتے
جب کہ رنج و ملال ہوتا ہے — سچ ہے ایسا ہی حال ہوتا ہے
زندگی شرط ہے تو آئیں گے — لطف صحبت کے پھر اُٹھائیں گے
دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رام پور نہیں
یاد رکھنا ہمیں یہ یاد رہے — اسی صورت سے اتحاد رہے
مصرع میرؔ پڑھ کے فرمایا — "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"[1]
وہ تو پہلو سے آہ بھر کے اُٹھے — اور ہم بے قرار ہو کے اُٹھے
جب وہ اک ایک سے چلے مل کر — خوب روئے مرے گلے مل کر
ادھر اس میہمان کی رخصت — تھی ادھر میری جان کی رخصت
ساتھ اس کے مری نگاہ گئی — جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی
روح کہتی تھی تجھکو دوں رخصت — دل پکارا کہ میں بھی لوں رخصت!
دل جگر دونوں تھرتھراتے تھے — پاؤں چلنے میں لڑکھڑاتے تھے
ضعف سے چل سکا نہ چار قدم — اک قدم راہ تھی ہزار قدم
اشک آنکھوں میں اور لب پر دم — جان جانے کو مستعد ہر دم
صبر ٹھہرائے کب ٹھہرتا ہے — سب سے پہلے سلام کرتا ہے

۱۔ اب تو جاتے ہو بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا (میر تقی میر)

کھیل کوئی نہیں نظر بازی نام اس کھیل کا ہے سر بازی
پہلے تھا اشتیاق کا صدمہ اب اٹھایا فراق کا صدمہ
آگئی ہجر کی اندھیری رات قبر کی رات تھی وہ میری رات
رات گزری مجھے دعا کرتے تھک گیا منہ خدا خدا کرکے
کس قدر مضطرب مرا دل تھا دل نہ تھا صید نیم بسمل تھا

41
254

جدائی

بیانِ حالت ہجراں ناہنجار وگلۂ فلک کج رفتار

اے فلک داد خواہ ہوں تجھ سے طالب رشکِ ماہ ہوں تجھ سے
یہ ستم دیکھ اور مجھ کو دیکھ یہ اَلم دیکھ اور مجھ کو دیکھ
وہ نکیلی ادائیں دھیان میں ہیں وہ سریلی صدائیں کان میں ہیں
گر نہیں وصل یار جانی کا لطف کیا ایسی زندگانی کا
ہجر باعث ہے خستہ جانی کا ہجر دشمن ہے زندگانی کا
ہجر سے زخم جانستاں بہتر ہجر سے مرگ ناگہاں بہتر
ہجر دنیا سے لیکے جاتا ہے عاقبت خاک میں ملاتا ہے
دم پہ بنتی ہے ہجر کے غم سے اس کو پوچھو جناب آدمؑ سے
تیرگی ہے جو یہ شبِ غم میں ہے سیہ پوش میرے ماتم میں
ہوئے سرکھول کر شب ہجراں اشک شبنم سے صبح تک گریاں
اس سیاہی میں کیا سحر ہو نمود گھر گیا دودِ آتشِ نمرود

دیکھ کر آہِ آتشیں کے شرر
دانت پیسا کئے بہت اختر

داستاں گو ہے نالۂ شبگیر
خوب سوتی ہے چین سے تقدیر

کیوں فلک انتہائے جور بھی کچھ
ظلم باقی رہا ہے اور بھی کچھ

یوں کسی کو ہلاک کرتے ہیں
یوں جلاتے ہیں خاک کرتے ہیں

ہمہ تن یاس کردیا تو نے
ستیاناس کردیا تو نے

دل ستانے سے درگزر ہی نہیں
آہِ مظلوم سے حذر ہی نہیں

ہوگئے خاک من چلے لاکھوں
مرگئے کاٹ کر گلے لاکھوں

میں ہی کیا ہوں تری جفا کے لیے
رحم کر رحم کر خدا کے لیے

کسی کروٹ سے کل نہیں آتی
نہیں آتی اجل نہیں آتی

جی بہلتا نہیں کسی صورت
دم نکلتا نہیں کسی صورت

ضعف سے دونوں مل گئے پہلو
چھِن بستر سے چھل گئے پہلو

چشم نمناک ہے تو دل غمناک
سینہ صد پارہ و جگر صد چاک

تپ دوری نچوڑتی ہے مجھے
دم بدم روح چھوڑتی ہے مجھے

ضعف سے قلب تھرتھراتا ہے
درد بھی اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہے

چشم پر خوں سے ندیاں جاری
ریشِ ناخن سے تن پہ گلکاری

چھبتی ہے کوئی شے کلیجے میں
ہوک سی اٹھتی ہے کلیجے میں

دل کی حالت بری ہے سینے میں
سانس چلتی چھری ہے سینے میں

لگ گئی کس کی بد دعا مجھ کو؟
میرے اللہ کیا ہوا مجھ کو؟

دل سے پہروں کلام کرتا ہوں
زندگی کو سلام کرتا ہوں

غمِ جاں کاہ میہماں دل کا
اشکِ غماز راز داں دل کا

جب فلک پر نگاہ جاتی ہے عرشِ اعلیٰ تک آہ جاتی ہے
پہنچی ہے آسمان تک فریاد نہ گئی اس کے کان تک فریاد
دردِ دل سائبان ہے گویا دوسرا آسمان ہے گویا
رات دن مجمع پریشانی خانہ آباد خانہ ویرانی
دل میں ہر آن کاہشِ دوری لب پہ ہر وقت ہائے مجبوری
دل ہے بیتاب تو جگر بے چین ہے مصیبت میں گھر کا گھر بے چین
دل میں ہر وقت ایک تازہ ملال انقلاب زمانہ شاملِ حال
نامرادی مراد پاتی ہے تلخ کامی مزے چکھاتی ہے
نامور ہے وہ میری گمنامی پُر اثر ہے وہ میری ناکامی
یہ جو لکھے قلم زباں نہ رہے لوح محفوظ تک نشاں نہ رہے
بے کسی میری غمگساروں میں ناامیدی امیدواروں میں
لطف ملتا ہے جان کھونے سے شاد ہوں رات دن کے رونے سے
چشم تر پر ہے گوشہِ داماں کا چاک ہنسنے لگا گریباں کا
لحدِ تنگ کنج تنہائی جیتے جی منہ پہ مردنی چھائی
چارہ گر سے دوا نہیں ہوتی نہیں ہوتی شفا نہیں ہوتی
درد دل کا علاج مشکل ہے بچ گئے کل تو آج مشکل ہے
کل جو امید تھی وہ آج نہیں مرضِ موت کا علاج نہیں
جان جاتی ہے دل کے آنے سے موت آتی ہے اس بہانے سے
گرد بیٹھے طبیب روتے ہیں مجھ کو میرے نصیب روتے ہیں
نبضیں چھوٹی ہوئی طبیبوں کی پیش چلتی نہیں غریبوں کی

ہر کوئی اپنی اپنی کہتا ہے — رائے میں اختلاف رہتا ہے
جو اطبائے وحشت دل ہیں — اُن کو کپڑے چھڑانے مشکل ہیں
جو عیادت کو میری آتا ہے — دیکھ کر دور ہی سے جاتا ہے
میری باتوں سے وہم آتے ہیں — سننے والوں کے ہوش جاتے ہیں
بات کی بات میں پلٹ نہ پڑے — یہ سڑی ہے کہیں لپٹ نہ پڑے
مژدۂ وصل کب سناتے ہیں — لوگ یٰسین پڑھنے آتے ہیں
دشمنِ نام و ننگ کون کہ میں! — اپنے جینے سے تنگ کون کہ میں!
دشمنِ اضطراب کون کہ میں! — مبتلائے عذاب کون کہ میں !
تیرِ غم کا نشانہ کون کہ میں! — پائمالِ زمانہ کون کہ میں!
عاشقِ بے وقار کون کہ میں! — سب میں بے اعتبار کون کہ میں!
مضطر و ناشکیب کون کہ میں — صید دام فریب کون کہ میں!
چشم برراہِ یار کون کہ میں! — ہمہ تن انتظار کون کہ میں!
تیغ حسرت اُتر گئی دل میں — بیقراری ٹھہر گئی دل میں
اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں — دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں
شوق کہتا ہے میرے ساتھ آؤ — ضعف کہتا ہے بیٹھ بھی جاؤ
چین ملتا نہیں کہیں مجھ کو — آسماں ہوگئی زمیں مجھ کو
موت آئے یقیں نہیں آتا — نفسِ واپسیں نہیں آتا
اب کہاں وہ صفائیاں منہ پر — چھٹ رہی ہیں ہوائیاں منہ پر
رنج کھاتا ہوں اشک پیتا ہوں — یہی کھاپی کے روز جیتا ہوں
جتنے ارمان ہیں مرے دل میں — سب وہ پیکان ہیں مرے دل میں

کھیل کوئی نہ عمر بھر کھیلے
ہم جو کھیلے تو جان پر کھیلے

پھوٹ کر روئے پاؤں کے چھالے
بہہ گئے جن سے ندیاں نالے

گرہوں روکش یہ دیدۂ پرنم
پانی پانی ہو گریۂ آدم

رنج کھانے سے کام ہے مجھ کو
دانہ پانی حرام ہے مجھ کو

فکر افشائے راز سے خاموش
کبھی کچھ ہوش میں کبھی بے ہوش

الفراق الفراق دردِ زباں
الاماں الاماں یہ شورِ فغاں

جو فرشتے ہیں آسمانوں پر
ہاتھ رکھے ہوئے ہیں کانوں پر

غمِ دوری سے جان بیکل ہے
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

کوئی مہماں جو میرے گھر آیا
میں نے جانا پیامبر آیا

لیں بلائیں ہزار ہا میں نے
دیں دعائیں ہزار ہا میں نے

اس کو باتوں میں کھولتا تھا میں
خط کمر میں ٹٹولتا تھا میں

کبھی پیتا تھا پاؤں دھو دھو کر
کبھی ہنستا تھا خوب رُو رُو کر

کبھی قدموں پہ اس کے گرتا تھا
کبھی میں اس کے گرد پھرتا تھا

خبر یار پوچھتا تھا میں
حال اغیار پوچھتا تھا میں

رنگ کیا ہے امیدواروں کا
ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا

کونسے شخص پر عنایت ہے
رات دن کس سے گرم صحبت ہے

سنتے ہیں داستانِ غم کہ نہیں
یاد آتے ہیں اُن کو ہم کہ نہیں

کس سے ہر وقت ہم کلامی ہے؟
کون سرکار کا سلامی ہے؟

بزم آرائیوں کا شوق بھی ہے؟
اب وہ شعر وسخن کا ذوق بھی ہے؟

ہیں طبیعت میں ولولے کیا کیا؟
رات دن کے ہیں مشغلے کیا کیا؟

میہماں سن کے یہ مری تقریر
تھا تحیّر میں صورتِ تصویر

اس کو حیرت یہ ماجرا کیا ہے؟
میزباں کو جنوں ہے سودا ہے!

میری حالت پہ اس کو سکتا تھا
شکل آئینہ منہ کو تکتا تھا

نظر آئی جو اس کی حیرانی
سخت مجھ کو ہوئی پشیمانی

کون مہمان ہو کے آئے گا
یوں تلاشی جو دے کے جائیگا

ہوش آیا تو شرمسار ہوا
پھر وہی جوشِ انتظار ہوا

97
351

عاشق کی تصویر سے معشوق کی مخاطبت

یہ سنا ہے کہ وہ پری پیکر
یاد کرتا ہے مجھ کو یوں اکثر

میری تصویر رکھ کے پیش نظر
کوسنا چھیڑنا یہ کہہ کہہ کر

اس ڈھٹائی سے تو اِدھر دیکھے
آنکھیں پھوٹیں ہمیں اگر دیکھے

کس طرح گھورتا ہے بلبے شریر!
جی میں آتا ہے پھونکدوں تصویر!

تو سہی رات دن رلاؤں تجھے!
دیکھنے کا مزا چکھاؤں تجھے!

ایسی صورت پہ یہ دماغ ترا!
خوب رکھا ہے نام داغ ترا!

حسن ہوتا ہے حاصلِ تصویر!
روسیہ! تو ہے قابلِ تصویر!

شکلِ منحوس کیوں نظر آئے؟
مول لے کر بھی ہم تو پچھتائے!

ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر، بلا سے ہنسی تو آتی ہے

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لیے
رکھ لیا ہے نظر گذر کے لیے!

نہ ہو کچھ اس سے رونق تعمیر
اور دھبہ لگائے یہ تصویر

تو ہے رنج و ملال میں کس کے
چپ لگی ہے خیال میں کس کے

کیوں ہے خاموش لب تو کھول ذرا!
وہ بڑے بول اب تو بول ذرا!

لن ترانی کہاں گئی تیری
خوش بیانی کہاں گئی تیری

آرزوے وصال کہہ تو سہی؟
کیا ہوا تیرا حال کہہ تو سہی؟

جھوٹ سچ ہم کو آزمانا ہے
عشق ہے یا فقط بہانا ہے

تیرے منہ میں زبان ہے کہ نہیں
تجھ میں کم بخت جان ہے کہ نہیں؟

کونسا تھا وہ آئینہ رخسار
تجھ کو سکتے کا دے گیا آزار

آئینہ تیرے منہ پہ رہتا ہے
اس سے کیا اپنا حال کہتا ہے؟

دام دے کر تجھے خریدا ہے!
تجھ پہ ہر طرح اپنا دعویٰ ہے

ہاں زلیخا مجھے نہ ٹھہرانا!
بن کے یوسف کہیں نہ اترانا!

بال باندھا مرا غلام ہے تو
اسی باعث سے نیک نام ہے تو

طائر رنگ اُڑ کے چل نہ سکے
تیری حسرت کبھی نکل نہ سکے

بھاگ کر بے وفا نہ ہوجانا
محض ناآشنا نہ ہوجانا

نہ کہیں گے کہ صورت اچھی ہے
ہاں مگر کچھ طبیعت اچھی ہے

تیری تصویر کا بہانا ہے
تیرا خاکہ بہت اُڑانا ہے

پہلے تو اس کو چاک چاک کروں!
اور پھر میں جلا کے خاک کروں

کیا یہ تصویر لاجواب نہیں
سو سُنے ایک کا جواب نہیں!

ان کی تصویر پر نظر ہر دم
مجھ کو تقدیر پر نظر ہر دم

معشوقہ کی آمد

صورتِ نامہ و پیام رہی خط کتابت کی دھوم دھام رہی
اُن کو لکھا بطور استمزاج سارے میلوں سے ہے یہ بڑھ کر آج
دیکھو تم بے نظیر کے جلسے! ہر برس ہو شریک اوّل سے!
تم نے بھی رنگ اس کے دیکھے ہیں! تم نے بھی ڈھنگ اس کے دیکھے ہیں!
کچھ رہو رامپور میں آکر! لطف اٹھاؤ! حضور میں آکر!
پر یہ ہے شرط آ کے میلے میں پھنس نہ جاتا کسی جھمیلے میں!
آئی مجھ کو جواب میں تحریر اپنے آنے کے باب میں تحریر
ایسے میلے میں کیوں نہ آئیں ہم کہ جہاں تم سا شخص پائیں ہم
کوئی جلسہ دکھانے والا ہو کوئی ہم کو بلانے والا ہو
بے بلائے جو آئے کیا آئے منہ اٹھائے جو آئے کیا آئے
کیا نہیں ہم کو شوق خوب کہی کیا نہیں ہم ذوق خوب کہی
باغ کی ہم بہار لوٹیں گے داغ کی ہم بہار لوٹیں گے
سب یہ کہتے ہیں سیر بہتر ہے ہم بھی سمجھے تو خیر بہتر ہے
فائدہ کیا ہے ہم کو حیلے سے آئیں گے پر اسی وسیلے سے
تم دراندازیوں کو کیا جانو! تم فسوں سازیوں کو کیا جانو!
فتنہ پروازیاں بھی ہوتی ہیں رخنہ اندازیاں بھی ہوتی ہیں
تم کو اس کی خبر بھی ہے کہ نہیں نیک و بد پر نظر بھی ہے کہ نہیں
جن سے تم التجائیں کرتے ہو ہر طرح کی وفائیں کرتے ہو!

تم سمجھتے ہو وہ خلاف نہیں وہ ذرا تم سے دل میں صاف نہیں
کہیں بدظن بھی دوست ہوتے ہیں کہیں دشمن بھی دوست ہوتے ہیں
باز آئے ہم ایسے آنے سے کہ بندھیں مورچے زمانے سے
خط پہ خط بے سبب نہیں آتے جب تو آتے پر اب نہیں آتے
رسم و راہ پیام سے گزرے اُس پیام و سلام سے گزرے
ایک صاحب جنھوں نے روکا تھا اُن کو مد نظر تماشا تھا
کوئی دن داغؔ کو جلائیں ہم اس جلانے کے لطف پائیں ہم
گر رقابت کا واسطہ ہوتا تو خدا جانے کیا سے کیا ہوتا
بے سبب جن کو یہ عداوت ہو واسطہ ہو تو کیا قیامت ہو
مجھ کو صبر و قرار مشکل تھا طبع پر اختیار مشکل تھا
ہے عجب شئے امیدواری بھی لطف دیتی ہے بے قراری بھی
خبرِ دل ربا نہیں آتی اس طرف کی ہوا نہیں آتی
مژدۂ جاں فزا نہیں سنتے ہم خوشی کی صدا نہیں سنتے
گوش زد اک نوید تھی ہر روز وہ گئے دن کہ عید تھی ہر روز
دل دُکھانے سے کام ہے تجھ کو اے محبت سلام ہے تجھ کو
مصلحت جان کر گلا چھوڑا جذب دل پر معاملہ چھوڑا
کفِ افسوس کس طرح نہ ملے آدمی کیا کرے جو بس نہ چلے
میں نے سوچا یہ امر اولیٰ ہے وہ بلائیں جنھوں نے روکا ہے
اُن کی کس کس طرح اطاعت کی پھر انھوں نے بھی یہ عنایت کی
صاف دل سے مراسلا بھیجا کہ بنارس انھیں بلا بھیجا

آئے جس وقت وہ بنارس میں　　میں نے جانا کہ آگئے بس میں

میری تقریر اُن کو لے آئی　　میری تدبیر ان کے لے آئی

جا کے عہدِ شباب کا آنا!　　تھا دوبارہ حجاب کا آنا!

کیا مرے دلستاں کا آنا ہے　　یہ تو روحِ رواں کا آنا ہے

نکہت گل ادھر پلٹ آئی　　عمر رفتہ مگر پلٹ آئی

تھا یہ اس رشک حور کا آنا　　چشم اعمیٰ میں نور کا آنا

تھا یہ اس گلعذار کا آنا　　یا نسیمِ بہار کا آنا

پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　کہ برس دن کے بعد عید آئی

میرے معجز بیاں کا آنا ہے　　یا مسیحِ زماں کا آنا ہے

لعل نکلا ہے یا بدخشاں سے　　ماہِ کنعاں چلا ہے کنعاں سے

بزم میں شمعِ انجمن آئی　　یا بہارِ گلِ چمن آئی

میرے غمخوار جاکے لائے انھیں　　نہ بنی کچھ بغیر آئے انھیں

میں نے پایا جو اپنے دلبر کو　　آبِ حیواں ملا سکندر کو

ایسی دولت نصیب ہو کس کو　　گنجِ قاروں ملا ہے مفلس کو

میرے یوسف کی دھوم پیہم ہے　　مصر سے رام پور کیا کم ہے

آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ　　ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ

وہم بھی بے قیاس تھا ان کو　　پاس والوں کا پاس تھا ان کو

لے لی چپکے سے دل میں چٹکی بھی　　پھر تشفی بھی پھر تسلی بھی

پہلے کچھ بات کی تو رک رک کر　　پھر کہا میرے کان میں جھک کر

کیا نہیں حسرتِ وصال ہمیں!　　وضع داری کا ہے خیال ہمیں

ہم جو آئے یہ دل ہمارا تھا
ورنہ کیا آپ کا اُجارا تھا

جب لیا نام وضع کا اُس نے
پی گیا سن کے جو کہا اس نے

کھل گئے کان جب سنی ایسی
کھل گئی جان جب سنی ایسی

بجھ گیا دل انار سا چھٹ کر
رہ گیا سینہ میں دھواں گھٹ کر

خوف اغیار پر ہنسی آئی
اُن کے انکار پر ہنسی آئی

میں نے کی عرض یہ بجا یہ درست
آپ نے جو کہا کہا یہ درست

بات مطلب کی میں کہوں! توبہ!
اپنے مہماں کو رنج دوں توبہ

اپنے سر کیوں دھروں پرائی بات
کیوں بگاڑوں بنی بنائی بات

کام مجھ کو تو ہے اطاعت سے
کیا غرض شکوہ و شکایت سے

ابھی کیا جانو! وضع داروں کو
دیکھ لو گے وفا شعاروں کو!

وضع نبھتی ہے وضع داروں سے
یا اطاعت کے خواستگاروں سے

وہ کہیں پاس وضع کرتے ہیں
جو یہ جانیں یہ ہم پہ مرتے ہیں

طور سے غیر غیر دیکھو گے
چار دن بعد سیر دیکھو گے

میرے کہنے کی داد دو گے تم
نام ان کا کبھی نہ لو گے تم

صبر میں نے کیا برس دن تک
کیا قیامت ہے اور دس دن تک

دل کو جو تیری یاد دیتا ہے
صبر کی وہ بھی داد دیتا ہے

اک جہاں اپنا دیکھا بھالا ہے
جانتا ہوں جو ہونے والا ہے

75
455

واپسی

چار دن میں یہ اتفاق کی بات
اُن سے ایسی ہوئی نفاق کی بات

پیش آئی جو امتحاں میں نہ تھی
وہ پڑی شکل جو گماں میں نہ تھی

نازنینوں سے نرمیاں بہتر
نہیں ہوتی ہیں گرمیاں بہتر

نہ کسی کو بُرا کہے نہ سنے
عمر بھر جو الف سے بے نہ سنے

کوئی جھڑکی نہ کوئی گالی تھی
اک شکایت مزے سے خالی تھی

دل شکایت سے ٹوٹ جاتا ہے
جی محبت سے چھوٹ جاتا ہے

اس شکایت نے یہ قباحت کی
کہ بڑھیں رنجشیں قیامت کی

نشۂ زور و زر کی سرمستی
اور پھر کس قدر زبردستی

اس کو ضد آئے یہ خدا نہ کرے
وہ مچل جائے یہ خدا نہ کرے

منہ سے جس بات پر نہیں نکلی
دل سے پھر عمر بھر نہیں نکلی

آدمی کچھ غرض سے دبتا ہے
جب اٹھائے طمع تو پھر کیا ہے

بات کو زخم کوئی بھرتا ہے
آبرو دار اس سے مرتا ہے

یہ گرہ دل سے کب نکلتی ہے
جان جاتی ہے جب نکلتی ہے

لوگ چالیں ہزار چلتے ہیں
توبہ توبہ یہ بل نکلتے ہیں

کوئی ایسوں کی دال گلتی ہے
پیش کب ہر کسی کی چلتی ہے

جب ادا ہی نہ ہو سکے جی سے
فائدہ کیا قضائے عمری سے

شاد رہنے سے شاد رہتا ہے
ورنہ پھر نامراد رہتا ہے

کوئی نازک مزاج دبتے ہیں
صاحبِ احتیاج دبتے ہیں!

اپنے حق میں یہ زہر گھول لیا — طعنے دے دے کے رنج مول لیا
ایسی بگڑی کہ آج تک نہ بنی — ایسی چھٹی کہ آج تک نہ بنی
کسی جانب سے تھا ملال انھیں — کسی جانب سے انفعال انھیں
پھر تو وہ ٹوٹ کر ادھر آئے — دام سے چھوٹ کر اِدھر آئے
یہ کہا اب وہ دل کہاں اپنا — تھا غلط سربسر گماں اپنا
پاس ان کا کیا! ہمیں چوکے! — کیوں کیا؟ کیا کیا؟ ہمیں چوکے!
کیا زمانے نے رنگ بدلا ہے — ابتدا کیا تھی انتہا کیا ہے
آگے کیا ایسے ذکر چھیڑوں میں — گڑے مردے عبث اکھیڑوں میں
گذری اوقات عیش وعشرت سے — دو مہینے تک ایک صورت سے
دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے — میرے کہنے کو دل میں مان گئے
پھر یہ سمجھے کہ اپنا گھر ہے بھلا — عقل مندوں کی داغؔ دور بلا
بولے میری بلا قفس میں رہے — آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رام پور مجھے — جلد رخصت کریں حضور مجھے
ایک انداز سے ہوئے رخصت — بڑے اعزاز سے ہوئے رخصت
کیا کہوں میں کہ کس چلن سے رہے — رہے جب تک وہ بانکپن سے رہے
پھر وہ سمجھے یہ مر ہی جائے گا — ڈوب جائے گا زہر کھائے گا
آؤ اس کی تسلیاں کردیں — جی میں جو کچھ ہے وہ بیاں کردیں
مجھ سے کہنے لگے سنو صاحب! — اس قدر مضطرب نہ ہو صاحب
صبر کا پھل ضرور پاؤ گے! — اس کی راحت بہت اٹھاؤ گے!
اب تو اپنے وطن کو جائیں گے — آؤ گے بھی؟ اگر بلائیں گے!

بات کا موقع و محل دیکھو　　کیا زمانہ ہے آج کل دیکھو
وہ جو دم دوستی کا بھرتے ہیں　　تم سے در پردہ رشک کرتے ہیں
ڈر ہے دشمن کی دوستداری سے　　کام لازم ہے ہوشیاری سے
دم دلاسے وہ مجھ کو دیکے گئے　　مجھ سے آنے کا عہد لے کے گئے
چلتے چلتے کہا خدا حافظ　　اب تمہارا مرا خدا حافظ!
صبح کو وہ ادھر سوار ہوئے　　ہم اجل کے امیدوار ہوئے
زندگی بھر یہ کب ہوا صدمہ　　پہلے کیا تھا جو اب ہوا صدمہ
گو سراسر ملال تھا وہ ہجر　　اس کے آگے وصال تھا وہ ہجر

46/501

بلاوا

سنئے خوبی مرے نصیبوں کی　　کہ بن آئی وہاں رقیبوں کی
اپنے بیگانے گھیرتے ہیں اُسے　　میرے رستے سے پھیرتے ہیں اُسے
ہوے دس بیس رخنہ گر پیدا　　کئے سو فتنے لاکھ شر پیدا
بنے اس کے مشیر وہ انساں　　آئے جن کے فریب میں شیطاں
یہ لگایا بلاؤ تو اُن کو　　تم کبھی آزماؤ تو اُن کو
دیکھیں کیسے ہیں چاہنے والے　　رسم الفت نباہنے والے
کتنے پانی میں ہیں ذرا دیکھو　　وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو
چاہتے ہیں تو اڑ کے آئیں گے　　ورنہ ہر طرح ہچکچائیں گے
تم کو بھولا جو دیکھ پایا ہے　　کہہ دیا ٹوٹ کر دل آیا ہے

تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا	داغؔ ہے چالیا زمانے کا
سحر آمیز اس کی باتیں ہیں	درد انگیز[1] اس کی باتیں میں ہیں
یہ ہے کیا بات سوچئے اس کو	منہ لگایا ہے آپ نے کس کو
ایسے معشوق کب نصیب اُسے	مل گئے ایک تم عجیب اُسے
ایسی تقدیر ہے کہاں اس کی	تم کرو پاسداریاں اس کی
کبھی کیجئے تو امتحان وفا	راست ہے یا غلط گمانِ وفا
ہو برا ان لگانے والوں کا	جھوٹی سچی لگانے والوں کا
کب شرارت سے باز آتے ہیں	آگ پانی میں یہ لگاتے ہیں
کہنا سننا ہے کینہ خواہوں کا	جم گیا رنگ روسیاہوں کا
کچھ کدورت سی آ گئی اس کو	اور بھی کچھ سما گئی اس کو
جب سنی ہر شریر کی تقریر	ہو کے خاموش صورتِ تصویر
دل میں سوچا یہ وہ بتِ ناکام	دور بیٹھے ہوں کس لیے بدنام
بھیج کر خط بلایئے ان کو	واقعی آزمایئے اُن کو
نامہ میری طلب میں آ ہی گیا	جس سے میں اک غضب میں آ ہی گیا

23
524

معشوق کا خط عاشق کے نام

مجھ کو لکھا کہ اے مرے بیتاب	دن کو بے چین رات کو بے خواب
اے پریشان و مضطر و ناشاد	تیرے دل میں رہی ہماری یاد

[1] آمیز۔تمکین

اے سزا وار جور بے تقصیر
اے طلب گار لذّتِ تعزیر

تازگی بخش نامِ ذوقؔ و نصیرؔ
رشکِ سوداؔ و دردؔ و مومنؔ و میرؔ

اے سخن گوئے عیسوی اعجاز
اے سخن سنج سامری انداز

تو گرفتارِ بندِ زلف رہے
دل اسیرِ کمند زلف رہے

درد الفت سے لب پہ شیون ہو
میری کاکل ہو تیری گردن ہو

ناوکِ ناز کا شکار رہے
تیغ ابرو سے دل فگار رہے

لبِ معجز بیاں سے دم نکلے
تیرے دل سے نہ میرا غم نکلے

ہو مبارک یہ پیارا پیارا عشق
راس آئے تجھے ہمارا عشق

ہم نئی روز بات سنتے ہیں
تازہ اک واردات سنتے ہیں

کوئی کہتا ہے بے قرار تمھیں
کوئی کہتا ہے اشکبار تمھیں

کوئی کہتا ہے چپ لگی ہے انھیں
سخت دشوار زندگی ہے انھیں

کھاتے ہیں پیتے ہیں نہ سوتے ہیں
مفت رو رو کے جان کھوتے ہیں

کوئی کہتا ہے نالے کرتے ہیں
کوئی کہتا ہے تم پہ مرتے ہیں

بھر گئے کان حال سن سن کر
ذکر رنج و ملال سن سن کر

سن کے یہ حال ہر زباں سے ہم!
لائیں پتھر کا دل کہاں سے ہم

یاد ہے قول اس زمانے کا
تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا

کس سے مل کر خوشی میں پھول گئے
تم یکایک جو ہم کو بھول گئے

بڑے خوش خلق و نیک ہو تم تو!
دلّی والوں میں ایک ہو تم تو!

ہم یہاں تم وہاں تو لطف نہیں
ہو یہ دوری جہاں تو لطف نہیں

لوگ کہتے ہیں وہ تڑپتے ہیں
ایسے ہوتے ہیں جو تڑپتے ہیں

چین سے اپنے گھر میں رہتے ہو
بزم والا گھر میں رہتے ہو
رسم الفت نباہتے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اُٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ
کوئی روکے مگر چلے آؤ!
ریل میں اتنی دور آنا کیا
کار سرکار کا بہانا کیا
ہم بلائیں نہ آئیں آپ چہ خوش
اور اس پر رہے ملاپ چہ خوش؟
یہ جگہ سیر گاہِ عالم ہے!
آج اس پر نگاہ عالم ہے!
میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں
عیش وعشرت کے لطف باہم ہوں
جب کسی نے طلب کیا آئے
آئے پچتا کے پھر تو کیا آئے
دلبروں سے دغا نہیں کرتے
ایسے اہل وفا نہیں کرتے
گر کسی اور راہ سے ہوگا
عذر بدتر گناہ سے ہوگا
نامۂ دلنواز جب آیا
میں نے سوچا یہ کیا غضب آیا
دل تو کہتا تھا سر کے بل چلئے
جس طرح ہوسکے نکل چلئے
شکل چلنے کی آہ کچھ نہ بنی
وضع تھی سدّ راہ کچھ نہ بنی
کار سرکار نے جو آگھیرا
قدم اُٹھ اٹھ کے رہ گیا میرا
ملتی ہے کام سے کہیں فرصت
مجھ کو مرنے کی بھی نہیں فرصت!
رات دن رنج میں گذرتی ہے
اک شش و پنج میں گذرتی ہے
عذر کیجیے یہ بات مشکل ہے
جایئے تو نجات مشکل ہے
نکتے نکتے پہ ہے خیال اسے
ہو نہ جائے کہیں ملال اُسے
آفتِ روز گار ایک طرف
اس کے دل کا غبار ایک طرف
منزلِ دوست دور اتنی ہے
ریل بھی تھک کے چیخ اُٹھتی ہے

شکل کیسی پڑے خدا معلوم　　کیا ہو انجام کار کیا معلوم؟
سوچتا تھا جواب کیا لکھوں　　قہر ٹوٹے جو مدعا لکھوں
فکرِ مضموں میں غرق تھا پہروں　　ہاتھ میں خامہ رہ گیا پہروں
قصد جانے کا دل میں ٹھان لیا　　مجھ کو جانا پڑا یہ جان لیا
نامہ آخر جواب میں لکھا　　کچھ کا کچھ اضطراب میں لکھا

47
571

عاشق کا جواب

یا خدا! وہ فرشتہ بھجوادے!　　کہ مرا نامہ اس کو پہنچا دے
کاش میرا ہی کاتبِ اعمال　　اس کو جا کر سنائے حالِ ملال!
کوئی جائے جو گرد باد اُدھر　　جاؤں میں اس کے ساتھ اُڑ اُڑ کر
اے فغاں اپنے زور میں لے چل　　پہنچوں مکتوب شوق سے اوّل
اے مہ و مہر و گردشِ ایّام!　　تمھیں پہنچادو! چلتے پھرتے پیام
ہے کدھر قاصدِ سلیمانی　　کہے اس سے مری پریشانی
اے ہوا! بازوؤں میں تو بھر کے　　کھول دے پر مرے کبوتر کے!
لے چل اے چرخ تو بھی نامۂ یار　　کہ نہ جائیں یہ گردشیں بیکار
ابرِ تر! اشک تر کو تو لے جا!　　برق سوز جگر کو تو لے جا!
یوں ہمارا سلام پہنچانا!　　یوں ہمارا پیام پہنچانا!
اے مری جان! جان سے بہتر　　جان سے کیا؟ جہان سے بہتر
اے مہ آسمان زیبائی!　　جانِ خوبی جہانِ زیبائی!

اے بتِ لا جواب میں صدقے | اے سراپا حجاب میں صدقے!
شوخ رو، شوخ چشم، شوخ کلام | خوش ادا، خوش خرام، خوش اندام
مجھ کو تیرے رُخِ نکو کی قسم! | اپنے ارمان و آرزو کی قسم!
تیرے اقرار و مبدم کی قسم! | عہد کی قول کی قسم کی قسم!
اپنے آزار و رنج وغم کی قسم! | داغ کے درد کی الم کی قسم!
تیرے قدموں کی تیرے سر کی قسم! | اپنے دل کی قسم جگر کی قسم!
مصحفِ روئے پرضیا کی قسم! | جھوٹ کہتا نہیں خدا کی قسم!
تو ہے اے مہ جمال پیشِ نظر! | ہے ترا ہی خیال پیشِ نظر
سامنے دوسرا نہیں آتا | آئینہ دیکھنا نہیں آتا!
بھول کر تجھ کو میری یاد آئی! | دل ناشاد کی مراد آئی!
نہیں کہتا ہوں میں خوشامد سے | تیرے احسان بڑھ گئے حد سے!
اس قدر دھیان کون کرتا ہے! | ایسے احسان کون کرتا ہے!
یہی اکدن تری قسم ہوگا | کہ مرا سر ترا قدم ہوگا!
تجھ سے انصاف چاہتا ہوں میں | چشمِ الطاف چاہتا ہوں میں
آفتیں جتنی ہیں خدائی میں | میں نے جھیلیں تری جدائی میں
زندگانی سے یاس ہے مجھ کو | تیرے ملنے کی آس ہے مجھ کو
گو زمانہ ہو چاہنے والا | نہیں مجھ سا نباہنے والا
تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن | ہے سراسر یہ بات نا ممکن
میری عزت کو تم بھی جانتی ہو! | میری غیرت کو تم بھی جانتی ہو!
سب سے ہے تیری آرزو بڑھ کر | آرزو سے ہے آبرو بڑھ کر!

رشک اٹھا کر مجھے نہ مرنا ہو
زہر کھا کے مجھے نہ مرنا ہو

یہ نگاہیں کہیں نہ پھر جائیں
ہم نظر سے تری نہ گر جائیں!

بات کب ناگوار اٹھتی ہے
داغؔ سے کس کی عار اُٹھتی ہے

داغ کھاؤں خدا وہ دن نہ کرے
رشک کھاؤں خدا وہ دن نہ کرے

خونِ دل عاقبت نہ ہوجائے
سفر آخرت نہ ہوجائے

آدمی آبرو نہ کھو کے رہے
کیا رہے گر حقیر ہو کے رہے

داغؔ دُرّ عدن سے بہتر ہو
یہ مسافر وطن سے بہتر ہو

میں اٹھاؤں وہ اس سفر کے مزے
بھول جاؤں تمام گھر کے مزے

اہلِ تمیز مانتے ہیں مجھے
جاننے والے جانتے ہیں مجھے

رونق آرائے بزم میں ہی تو ہوں
زینت افزائے بزم میں ہی تو ہوں

یہ سر احسان سے نہیں واقف
یہ دل ارمان سے نہیں واقف

سر جھکا ہے وہیں خدا آگاہ
اس جبیں پر ہے خاکِ بیت اللہ

اسی ابرو کے وہ اشارے ہیں
جس پہ قربان ماہ پارے ہیں

ان نگاہوں کو کوئی کیا جانے
میری آنکھوں سے دیکھنا جانے

وہ طبیعت کہ جس میں خوئے وفا
یہ وہ بینی جو سونگھے بوئے وفا

لب سے ہر دم یہ کام لیتا ہوں!
کہ تمہارا ہی نام لیتا ہوں

کبھی سرگرم التجا نہ ہوئے
حرفِ مطلب سے آشنا نہ ہوئے

مفت کی قیل و قال کیا جانیں
لب ہمارے سوال کیا جانیں

لب کھلے تو تری دعا کے لیے
کب کھلے حرفِ مدعا کے لیے

اس زبان سے کلام کو رونق
اس بیاں سے پیام کو رونق

اس زباں میں بیان کی شوخی
اس بیاں میں جہان کی شوخی

کبھی اس کان سے بدی نہ سنی
بات اچھی سنی بری نہ سنی

یہ وہ گردن نہ جو خمیدہ رہے
اپنے بیگانے سے کشیدہ رہے

بارِ احسان غیر زائل ہو
دستِ معشوق ہی حمائل ہو

آئینہ گرد میرے سینے سے
کہ یہ سینہ ہے پاک کینے سے

مخزن علم داغؔ کا دل ہے
معدنِ حلم داغؔ کا دل ہے

انتخابِ زمانہ ہے یہ جگر
پر تمہارا نشانہ ہے یہ جگر

ہاتھ پیدا ہوے عطا کے لیے
پاؤں ہیں منزلِ وفا کے لیے

ہے یہ دربار شاہ کا صدقہ
اسی عالم پناہ کا صدقہ

اسی سرکار سے ہوئی تعلیم
اسی دربار سے ہوئی تعلیم

نیک و بد سب جتا دیا تم کو
حال اپنا بتا دیا تم کو

میں نہ لکھتا کبھی مگر لکھا
قدرداں تم کو جان کر لکھا

یہ دعا ہے کہ برقرار رہو
میرے حق میں وفا شعار رہو

تم کو اللہ شادماں رکھے
عمر بھر مجھ پہ مہرباں رکھے

داغؔ کی یاد میں حجاب رہے
ساتھ شوخی کے اضطراب رہے

خط روانہ ادھر شتاب کیا
اس طرح میں نے پا تراب کیا

یا خدا میری منزل آساں ہو!
منزل آساں ہو مشکل آساں ہو

69
640

کلکتہ کو جانا

مل گئی جب حضور سے رخصت میں ہوا رام پور سے رخصت
کہہ کے اٹھا اخیر یا قسمت راہ رو میں تو رہنما قسمت
جا کر اپنے وطن میں جی نہ لگا اس بنائے کہن میں جی نہ لگا
چل کے دلّی سے لکھنؤ پہنچا ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا
بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے
کچھ جو ارمان تھا نکال لیا شہر کو خوب دیکھ بھال لیا
خوب انجم[1] نے نے میہمانی کی اور بھی سب نے مہربانی کی
راہ میں کانپور الہ آباد میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آگیا عظیم آباد تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد
پیشوائی کے واسطے احباب آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لیے ہی جاتا تھا کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا میرے گھر چلیے آیئے اس طرف اِدھر چلیے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے میرزا[2] شاغل آئے جب وہ ہٹے
یہ وہ ہیں نام خلق ہے جن سے آدمیت مراد ہے ان سے
متقی پارسا بہت دیکھے خوش بیاں خوش ادا بہت دیکھے

۱۔ سید بہادر حسین انجم نیشاپوری ۲۔ آغا مرزا شاغل برادر اخیافی داغ

خوش گلو بھی کئی سنے میں نے　　خوبرو بھی کئی چنے میں نے
مجھ کو فرصت ملی نہ یاروں سے　　روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی　　یہ مروّت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں　　کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو　　ان کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
دیں وہ مہماں کو جس قدر چاہیں　　بخشدیں گھر کا گھر اگر چاہیں
میر باقر کے گھر قیام ہوا　　خوب دعوت کا اہتمام ہوا
آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی　　یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی
کیا قیامت تھی شہر کی گرمی　　کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آب میں گرمی　　مثلِ اخگر حباب میں گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ عاری ہو　　جائے نوری وہاں تو ناری ہو
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے　　عنصر آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہوگئے کاجل　　جل گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنور طوفاں بھی　　کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی
رنگت آخر طپش سے زرد ہوئی　　گرمیِ طبع داغؔ سرد ہوئی
سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا　　دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوق بے اختیار لے ہی گیا　　یہ دلِ بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ　　دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
ریل پر دوستانِ نیک خصال　　آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغؔ آیا　　داغؔ آیا تو باغ باغ آیا!

دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں
ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں

سر بازار وہ مکان بلند
جس کو کہئے اک آسمان بلند

چرخ کو رتبہ اس مکاں سے کہاں
دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں

شرم و غیرت سے چھپ گئی جنت
ورنہ یہ قصر دیکھتی جنت

ہم جو بالائے بام رہتے تھے
لوگ عالی مقام کہتے تھے

سامنے ناخدا کی مسجد تھی
ناخدا کیا؟ خدا کی مسجد تھی!

مظہرِ نور ہے یہی مسجد
بیت معمور ہے یہی مسجد

اثرِ سرمہ اس کی خاک کرے
جلوہ اس کا نظر کو پاک کرے

اس کا جلوہ سرور آنکھوں کا
اس کا دیدار نور آنکھوں کا

بخت بیدار و یار ہے دمساز
اے شبِ وصل تیری عمر دراز!

صبح سے شام تک جمال کے لطف
شام سے صبح تک وصال کے لطف

غم کی راتیں نہ تھے ملال کے دن
کیا پھرے تھے شبِ وصال کے دن

وصل کی شب میں جلوے تھے دن کے
سرمہ تھے حلق میں موذن کے

عیش و عشرت کی بات بات اچھی
رات سے دن تو دن سے رات اچھی

محفلِ عیش کا بندھا وہ سماں
دیکھیے پھر پھر کے جس کو عمر رواں

دوستوں سے بھری بھری محفل
چشم بد دور وہ پری محفل

بزم آرا تھے سب عدو کے سوا
کوئی نکلا نہ آرزو کے سوا

میری محفل میں دخل غیر کہاں
غیر ہو جس جگہ تو خیر کہاں؟

عیش سا عیش تھا نصیبوں میں
کھلبلی پڑگئی رقیبوں میں

ساری دنیا میں کیا کسی سے غرض!
اپنے معشوق کی خوشی سے غرض!

رات بھر تھا خوشی سے وہ عالم ۔ اشک شادی تھا قطرۂ شبنم
مسکراتے تھے لب جو دلبر کے ۔ کھلے جاتے تھے پھول بستر کے
پھول بھی ناگوار تھے اس کو ۔ ہار پھولوں کے بار تھے اس کو
ہر گھڑی نوک جھوک ہوتی تھی ۔ دمبدم روک ٹوک ہوتی تھی
گرچہ دیکھے ہزار صورت دار ۔ مگر ایسا کہاں طبیعت دار
قابلِ دید ہر کسی کی خوشی ۔ اور اس پر ہمارے جی کی خوشی
خود بخود دل کھلا ہی جاتا تھا ۔ قہقہہ لب پہ آہی جاتا تھا
کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
آتشِ حسنِ یار کی گرمی ۔ بزم میں اک بہار کی گرمی
گرچہ اکثر ہوا جنوبی تھی ۔ پر وہ عطرِ حنا میں ڈوبی تھی
چاندنی کے تمام شب جلسے ۔ دلکشا سقف پر عجب جلوے
یاد ہے ایک رشک گل کی سیر ۔ چودھویں رات کو وہ پُل کی سیر
ایسی صحبت میں کیوں نہ دل پرچے ۔ دل لگی کے تھے سینکڑوں چرچے
رات عیش و نشاط میں گزری ۔ صبح تک اختلاط میں گزری
مدعی لاکھ ڈر دکھاتے ہیں ۔ وہ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں
داغ سے رسم التفات نہ جائے ۔ سر بھی جائے تو جائے بات نہ جائے
لوگ سب خوش قماش خوش ترکیب ۔ اہل تمیز و صاحبِ تہذیب
ہم سے سرگرم اتحاد رہے ۔ عبد رزاق شاد شاد رہے
دوست با وضع ہے کہاں پیدا ۔ داغ اس وضع دار کا شیدا
میری رخصت کے دن تمام ہوئے ۔ عیش وعشرت کے دن تمام ہوئے

جلد حاضر ہو یہ پیام آیا　اور سر پر مہِ صیام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا　دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح سے رہ جاتے　ہوئے باؤں برس نمک کھاتے
دل خدا نے دیا غیور بہت　تھا یہ پاسِ نمک سے دور بہت
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے　تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے
یہ شرافت کا مقتضاہی نہیں　کہ شریفوں سے یہ ہوا ہی نہیں
کب میسر ہو روز گار ایسا　اور آقائے نامدار ایسا
کچھ تمنا نہیں رہی مجھ کو　کون سی شے کی ہے کمی مجھ کو
میری رخصت سے اُن کو حیرت تھی　کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی
فکر تشویش رنج تھا غم تھا　عوضِ نغمہ شورِ ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے　پاس بیٹھے تو منہ بنائے ہوئے
وہ جو گھبرائے میری اُف اُف سے　تو یہ کہنے لگے تاسف سے
چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ　ورنہ ہو لیتے ہم تمہارے ساتھ
ہم عزیزوں کو چھوڑ دیں کیونکر　سلسلہ اُن سے توڑ دیں کیونکر؟
تم بھی تنہا نہیں ستم یہ ہے　چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے
جو مرے پاس ہے تمہارا ہے　تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے
میں نے کی اختیار خاموشی　مجھ سے کب ہو نمک فراموشی
دل سے اپنے یہ گفتگو باہم　کیا رہے آئے کیا چلے کیا ہم
میں کہاں گریۂ شبانہ کہاں　سر کہاں سنگِ آستانہ کہاں
آبرو کا خیال آتا ہے　عرقِ انفعال آتا ہے

اپنے دلبر کو چھوڑ کر جائیں ایسے جانے سے کاش مرجائیں

وہ وفا دار برملا ٹھہرے ہمیں قسمت سے بے وفا ٹھہرے

مضطرب ہو کے ہم ٹھہر نہ سکے ایسے مجبور تھے کہ مر نہ سکے

اہلِ صحبت کو داغ دیکے چلے اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے

کیا کہیں جس طرح سے ہم آئے ہمہ تن حسرت و الم آئے

میرے ہمراہ میر قطب الدیں اشک ریزاں بحالتِ غمگیں

میری غمخواریوں سے کام انھیں میری دلداریوں سے کام انھیں

وہ مرے دل کو اس طرح لائے کوئی گھائل کو جس طرح لائے

کچھ نہ تھی مجھ کو جسم و جاں کی خبر نہ زمیں کی نہ آسماں کی خبر

ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا رمضاں ایک دن کے بعد آیا

دست بستہ حضور میں پہنچا بزم عیش و سرور میں پہنچا

مجھ سے دلشاد اک زمانہ ہوا موردِ لطف خسروا نہ ہوا

مرضِ غم سے کب افاقہ تھا دن کو روزہ تو شب کو فاقہ تھا

سحری اک زمانہ کھاتا تھا رمضاں مجھ کو کھائے جاتا تھا

صدمۂ ہجر و کاہش غم سے عید بدتر ہوئی محرّم سے

شادیانہ کا شور پیہم ہے میں سمجھتا ہوں میرا ماتم ہے

یاس ہو تو امید پھر کیسی دل نہ خوش ہو تو عید پھر کیسی

ہو کے خوش میں کبھی گلے نہ ملا کفِ افسوس بے ملے نہ ملا

عشق میں ایک فکر ناداری لاکھ بیماریوں کی بیماری

داغ کیوں جبر سے گلے ملتا کاش یہ قبر سے گلے ملتا

ایسی صحبت ہو دل کو کیا مرغوب ہجر محبوب و وصل نا مرغوب
سر و ساماں کہاں مقدر میں خاک اڑانے کو بھی نہیں گھر میں
کھانے پینے سے مجھ کو نفرت ہے عید کو روزہ کیا مصیبت ہے؟
ہائے جب زہر بھی نہ پائیں ہم کیا کلیجہ بُروں کا کھائیں ہم
خونِ دل بھی کمی سی کرتا ہے دیدۂ تر ہنسی سی کرتا ہے
لوگ سامان عیش کرتے ہیں داغ ارمانِ عیش کرتے ہیں
شبِ فرقت جو آہ کرتا ہوں تو خدا کو گواہ کرتا ہوں
آہِ فریاد کون سنتا ہے داد بیداد کون سنتا ہے
دردِ دل ہمنشیں نہیں سنتا کوئی سنتا نہیں، نہیں سنتا
کون یہ حال زار دیکھ سکے کون یہ انتظار دیکھ سکے
دوستوں کے کلیجے پھٹتے ہیں دشمنوں کے بھی دل اُلٹتے ہیں
گر کرے بھی اثر فغاں میری خاک ہوں جل کے ہڈیاں میری
میں یہ مژدہ سنوں وہ آئی موت کاش آئے مجھے پرائی موت
بد دعا دیتے ہیں بشر مجھ کو کھا گئے کوس کوس کر مجھ کو
تھے جو پروانہ سوز الفت سے اب وہ جلتے ہیں میری صورت سے
پند گو اپنی اپنی بکتے ہیں زخم دل پر نمک چھڑکتے ہیں
طعنے دے دے کے لوگ ہنستے ہیں روز تیروں کے مینھ برستے ہیں
ہورہی ہیں ملامتیں کیا کیا ٹوٹتی ہیں قیامتیں کیا کیا
طنز کرتے ہیں یہ لطیف و ظریف کہئے کیا ہے اب مزاج شریف
لو ذرا سا ہوا جو دل میلا پیشتر مرگ سے ہے وا ویلا

ہم تو دیکھیں وہ خوب رو ہے کہاں
ہم سنیں تو وہ خوش گلو ہے کہاں

تم نے دیکھا ہے تم نے برتا ہے
وہ تو مہر و وفا کا پتلا ہے

ایسی ہوتی ہے چاہ کیا کہنا
حضرتِ داغؔ واہ کیا کہنا!

مہر و الفت اسی کو کہتے ہیں
کیا مروّت اسی کو کہتے ہیں

ہے وہی آن بان میں پورا
اُترے جو امتحان میں پورا

جان جاتی ہے جن کے آنے سے
کھنچ گئے اور بھی بلانے سے

دلربا وہ جو اپنے پاس رہے
نہ کہ ملنے کی اس سے یاس رہے

طرفہ یہ رسم و راہ نبھتی ہے
آپ کی بے پناہ نبھتی ہے

بے وفا سے یقین الفت ہے!
آپ کا دم بہت غنیمت ہے؟!

دل میں کچھ شرگیں ہوا کہ نہیں
اب بھی تجھ کو یقیں ہوا کہ نہیں!

کچھ خطوں کی عبارتیں دیکھیں
شوخ فقرے شرارتیں دیکھیں

خوب انعام تم کو ملتے ہیں
الٹے الزام تم کو ملتے ہیں

غیر کا جب وسیلہ ہوتا ہے
عذر انکار حیلہ ہوتا ہے

غیرتِ مہر و ماہ وہ ہی تو ہیں
آپ کے خیر خواہ وہ ہی تو ہیں

ہم جو بولیں ہماری کیا طاقت
بھید کھولیں ہماری کیا طاقت

صحبت انجمن چھٹے کیوں کر
اُن سے اپنا وطن چھٹے کیوں کر

یوں ہی تڑپائیں گے رلائیں گے
مر بھی جاؤ گے تو نہ آئیں گے

وعدہ کیسا اگر کلام کریں
ہم تو جھک کو تمھیں سلام کریں

یہ تو مانا وہ وضع دار بھی ہیں　یہ تو مانا وفا شعار بھی ہیں
یہ بجا ہے ستم نہیں کرتے　جھوٹے قول و قسم نہیں کرتے
تم بڑے چین سے رہے سچ ہے　تم سا ہشیار جو کہے سچ ہے
دھوم ہے جابجا زمانے میں　نام روشن کیا زمانے میں
یوں ہی ہوتے ہیں چار سو رسوا　دربدر اور کو بکو رسوا
پیشتر جو نہیں کیا وہ کیا　عمر بھی جو نہیں کیا وہ کیا
نہ سہی وصلِ غیر یوں ہی سہی　کیوں بگڑتے ہو خیر یوں ہی سہی
سارے معشوق دیکھے بھالے ہیں　وہی دنیا سے اک نرالے ہیں
بے وفا جھوٹ با وفا کہیے　پاکدامن ہیں پارسا کہیے
بے وفائی انھیں نہیں آتی　کج ادائی انھیں نہیں آتی
بھولے بھالے ہیں گھات کیا جانیں　ابھی وہ اور بات کیا جانیں
آپ کا رنج وغم انھیں ہی تو ہے　پاسِ قول وقسم اُنھیں ہی تو ہے
خوبصورت نہیں کوئی ان سا　پاک طینت نہیں کوئی ان سا
آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں　اُن پر ایمان لائے بیٹھے ہیں
اپنے محبوب کا خیال رہے　سال دو سال تو یہ حال رہے
نہیں چپتا کوئی حسیں تم کو　آفریں ہے صد آفریں تم کو
کیوں کسی بت پر ہاتھ صاف کرو　تم تو مسجد میں اعتکاف کرو
ترک کرنا نہ مہر و الفت کو　بخشوائینگے وہ قیامت کو

دل پہ ہر وقت جبر کرتے ہیں — مرد ایسا ہی صبر کرتے ہیں
چپکے چپکے ہر اک کی سنتا ہوں — اپنے مطلب کی بات چنتا ہوں
کوئی تدبیر بن نہیں آتی — کوئی تقریر بن نہیں آتی
کان ہر شخص کے بیاں کی طرف — نگہِ یاس آسماں کی طرف
اے فلک کس بلا میں ڈال دیا — مجھکو جنت سے کیوں نکال دیا
اے فلک تجھ پہ بس نہیں میرا — کوئی فریاد رس نہیں میرا
دل کو آزار ہوگیا کیسا — بخت بیدار ہوگیا کیسا
کاہشِ غم سے روح گھٹتی ہے — آنکھوں آنکھوں میں رات کٹتی ہے
دل میں ہر وقت یاس رہتی ہے — کیا طبیعت اداس رہتی ہے
ہم جئیں گے یہ آس ہے کس کو — ہجر میں بھوک پیاس ہے کس کو؟
یہ سزائیں ضرور بھی تو نہیں — بے خطا ہوں قصور بھی تو نہیں
ہائے جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں — کس قیامت کے دن گذرتے ہیں
خانۂ عیش لٹ گیا کیسا — مجھ سے معشوق چھٹ گیا کیسا
رات دن جی رہے ہیں مر کر ہم — صحبتِ یار ہوگئی برہم
ہم پریشان گھر میں پھرتے ہیں — کہ وہ جلسے نظر میں پھرتے ہیں
کوئی دن رات کا مزا نہ رہا — رات کیا؟ بات کا مزا نہ رہا!
کون ہے التفات کس سے کریں — ہم کنایہ کی بات کس سے کریں!
دیدۂ منتظر ہے چار طرف — دل رشک آشنا ہزار طرف

درد اٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر بیٹھ جاتا ہوں ''ہائے دل'' کہہ کر!
سوز پنہاں سے گرم گرم آہیں ناتوانی سے نرم نرم آہیں
وہ طبیعت سنبھالنے والے میری حسرت نکالنے والے
دلربا ہے تو باوفا بھی ہے شوخ ہے صاحبِ حیا بھی ہے
گرچہ مل جائے مہرباں ایسا نہ ملے گا مزاج داں ایسا
یا الٰہی نجات غم سے ملے! وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

198
140
کل تعدادِ اشعار 838

تمت بالخیر

سنہ تخلیق ۱۸۸۲ء سنہ طباعتِ اول ۱۸۸۳ء

باب دوم

معاشقہ داغؔ اور حجابؔ

تمکین کاظمی

داغؔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بروز بدھوار دن کے دو بجے محلّہ چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شمس الدین خان تھا۔ جو فیروز پور جھرکہ کے رئیس اور احمد بخش خان کے بیٹے تھے یہ خاندان دہلی کا مشہور و معروف خاندان تھا۔ غالب کے خسر الٰہی بخش خان شمس الدین خان کے حقیقی چچا اور امین الدین خان اور ضیاء الدین خان نیر درخشاں ان کے چھوٹے بھائی تھے۔

شمس الدین خان کی دو بہنیں بھی تھیں جن میں سے کسی ایک کا عرف جہانگیرا بیگم تھا ولیم فریزر ان دنوں دہلی میں رزیڈنٹ یا اسی قسم کے کسی عہدے پر مامور تھا۔ اس نے کسی طرح جہانگیرا بیگم کو دیکھ پایا اور خود اس نے نواب شمس الدین خاں سے ان کی محبت کا ذکر والہانہ انداز میں کیا۔ جسے سن کر شمس الدین خاں کو سخت تکلیف ہوئی اور انھوں نے کریم خان عرف بہر مارو کو فریزر کے قتل کے لیے آمادہ کیا اور بہر مارو نے فریزر کو قتل کر دیا اسی اعانت مجرمانہ میں نواب شمس الدین خان کو ۳ را کتوبر ۱۸۳۵ء کو دہلی میں کشمیری دروازے کے قریب پھانسی دی گئی۔۔ ونسنٹ اسمتھ کے حوالہ سے میجر جنرل اسلیمین کے لکھا ہے کہ نواب شمس الدین خاں نے پھانسی کے روز ہلکے سبز رنگ کا نہایت مکلّف لباس زیب تن کیا تھا۔ مگر پھانسی کے وقت وہ لباس اتار دیا گیا تھا۔ جس وقت پھانسی دیدی گئی اور پھر لاش زمین پر لٹادی گئی تو لاش خود بخود تڑپی اور منہ کعبہ کی طرف ہو گیا اور اسی

حالت میں اُن کا دم نکلا۔

شمس الدین خاں کو پھانسی کے وقت داغ کے عمر چار سال چار ماہ نوروز کی تھی۔ اُن کی تسمیہ خوانی (بسم اللہ) کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ یہ حادثہ پیش آیا اس حادثہ کے بعد داغ کی والدہ پریشانیوں میں گھر گئیں مگر انھوں نے داغ کو اپنی بڑی بہن عمدہ خانم کے پاس بھجوا دیا جو نواب رامپور کی متوسل تھیں اور ان دنوں رامپور ہی میں تھیں اس لیے داغ کی ابتدائی تعلیم رامپور میں ہوئی اور مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے داغ نے فارسی پڑی اس طرح داغ اپنی خالہ کے پاس کبھی رامپور اور کبھی دہلی میں رہنے لگے۔

۱۸۴۴ء، ۱۲۶۰ھ میں مرزا فخرو ولی عہد دہلی نے داغ کی والدہ سے عقد نکاح کر لیا اور وہ قلعہ میں پہنچ گئیں تو انھوں نے داغ کو بھی قلعہ میں بلوا لیا اس وقت داغ کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ قلعہ میں داغ کی تعلیم باقاعدہ شروع ہوئی مولوی سید احمد حسین ابن میر غلام حسین شکیبا سے داغ نے درسی کتابیں پڑھیں، سید امیر پنجہ کش سے خطاطی سیکھی اور مرزا عبداللہ بیگ سے بانک، مرزا سنگی بیگ سے پھکیتی علی مد سیکھی سجن خاں اور بندو خاں چابکسواران شاہی سے شہ سواری سیکھی اور خود ولی عہد بہادر مرزا فخرو نے بندوق بازی تیر اندازی، چورنگ اور ستیا کا ٹنا سکھایا۔

ان دنوں قلعہ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا داغ کی طبیعت بھی اس طرف مائل ہوگئی اور شعر کہنا شروع کیا، مرزا فخرو نے داغ کی موزونی طبع دیکھی تو استاد ذوق سے رجوع کر دیا اور داغ اپنا کلام ذوق کو بتانے لگے ان دنوں قلعہ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور قلعہ کے باہر بھی بیسیوں مشاعرے ہوتے تھے، داغ

نے سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں   کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

اس کے بعد زینب باڑی کے مشاعرے میں داغ نے طرحی غزل پڑھی جب مقطع۔

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

پڑھا تو صہبائی نے اُٹھ کر گلے سے لگالیا۔

غالب کی غزل دم نکلے، ہم نکلے بہت مشہور ہوئی قلعہ میں بھی ایک مشاعرہ ہوا اور یہ طرح دی گئی داغ نے بھی طرح میں غزل کہی مگر اصلاح نہ ہوئی مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے سرسری طور پر ذوق نے دیکھ لیا، جب داغ نے مشاعرے میں غزل پڑھی تو شاہ ظفر نے۔

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

سنا تو داغ کو بلا کر پیشانی چوم لی۔

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں آسمان کے لیے طرح ہوئی تھی۔ داغ کو مومن اور ذوق کے بیچ میں جگہ ملی تھی چونکہ ذوق استادِ شاہ تھے اس لیے ہر مشاعرے میں سب سے آخری غزل انھیں کی ہوتی تھی۔ مومن کے بعد داغ کی باری آئی تو داغ نے اپنا رنگ جمتا ہوا نہ پا کر طرح میں غزل نہ کہنے کا عذر کر دیا اور ذوق نے غیر طرحی غزل پڑھنے کی اجازت دیدی داغ نے مطلع پڑھا۔

عجیب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

مشاعرہ دیر سے سنان تھا داغ کا مطلع سنتے ہی ایک سنسنی سی پھیل گئی اور ساری محفل چمک اُٹھی۔

اس طرح داغ نے ۱۸۵۶ء م ۱۲۷۲ء تک قلعہ میں عمر گزاری اس سال مرزا فخرو نے ہیضہ سے انتقال کیا اور داغ کو قلعہ سے نکلنا پڑا اور وہ چند روز دہلی میں رہ کر رامپور چلے گئے چنانچہ ۲۷ اپریل ۱۸۷۸ء کو جب ظہیر دہلوی معہ اپنے بھائی کے رامپور پہنچے تو داغ نے ان کی آمد کی اطلاع پا کر اُن سے ملاقات کی اور صاحبزادہ رضا محمد خاں (دامادِ یوسف علی خاں بہادر) سے سفارش کر کے انھیں نوکر بھی رکھا دیا۔ اس طرح داغ نے آٹھ سال رامپور اور دہلی میں ایسے گزارے کہ رامپور سے انھیں روپیہ ملتا رہتا تھا مگر کوئی خدمت تفویض نہ تھی اور نہ ہی باقاعدہ تقرر ہوا تھا۔ ۱۴/اپریل ۱۸۶۶ء کو داغ کا تقرر زمرۂ مصاحبین میں ہوا اور کارخانہ جات (فراش خانہ اصطبل وغیرہ) تفویض ہوئے۔

داغ نے اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ شاعری بھی جاری رکھی ان دنوں رامپور رشکِ بغداد و بخارا بنا ہوا تھا، بڑے بڑے عالم فاضل، صناع، شاعر رامپور میں جمع تھے صرف شعراء میں حسب ذیل بزرگ موجود تھے۔

اسیرؔ، امیرؔ، جلالؔ، ذکیؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، جانؔ صاحب، منصور علی منصورؔ رسا رامپوری، نثارؔ، غنیؔ، غمیںؔ، شاداںؔ، بدرؔ، بشیرؔ، صباؔ، سہوانی، شاغلؔ، حیاؔ، عروجؔ، بحرؔ وغیرہ۔

ہر ہفتہ مشاعرے ہوتے اور روزانہ ان شعراء سے مقابلے ہوا کرتے

اس طرح داغ کی طبیعت نہ صرف منجھ گئی بلکہ چمک اٹھی اور داغ حقیقی معنی میں داغ بن گئے۔

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور بڑے جدت پسند اور فراخ دل رئیس تھے۔ رامپور کوانھوں نے طرح طرح سے سنوارا نہ صرف علماء فضلاء اور اہل کمال کو جمع کیا بلکہ شہر کی آرائش وزیبائش صنعت وحرفت اور تجارت بڑھانے کی خاطر اپنی مسند نشینی ۱۸۶۵ء ۱۲۸۲ھ کے بعد سے ہی جدوجہد شروع کی چنانچہ مارچ ۱۸۶۶ء میں بے نظیر کا میلہ شروع کرادیا، یہ میلہ ماہِ مارچ کے آخر ہفتے میں شروع ہوتا اور ختم مہینے پر ختم ہوجاتا مگر کبھی کبھار اپریل کے پہلے ہفتے تک بھی توسیع دی جاتی تھی۔

یہ میلا چونکہ ایک باغ میں ہوتا تھا جس کا نام ''بے نظیر'' تھا اس لیے میلے کا نام بھی بے نظیر پڑ گیا، شہر رامپور سے تین میل کے فاصلے پر ایک کوٹھی ۱۲۳۲ھ میں نواب احمد علی خاں نے بنوائی تھی اس کی تکمیل کے بعد ۱۲۳۳ء میں اس کے اطراف ایک پر فضا باغ بھی بنوایا گیا جس کا نام باغِ بے نظیر رکھا گیا جن دنوں میلا شروع کیا گیا رامپور تک ریل نہ تھی بلکہ مرادآباد اسٹیشن سے اتر کر رامپور جانا پڑتا تھا مگر باوجود اس کے ممبئی، کلکتہ، دہلی، لکھنؤ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں سے بیوپاری میلے میں اپنا مال اسباب لاتے تھے خود نواب صاحب ذاتی طور پر مشاہیر ہند کو دعوت دیا کرتے اور دور دور سے لوگوں کو بلواتے تھے۔

اس زمانے میں ایک جدت پسند اور حاضر دماغ شخص جس قدر اہتمام کرسکتا تھا اتنا اہتمام میلے میں کیا جاتا تھا اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی، نواب خلد آشیاں نے ایک دس گز اونچی پھسلن بنادی تھی جس میں ایک چکنا پتھر نصب کیا

گیا تھا پھر اس پر تیل مل کر اُسے چکنا دیا جاتا تھا۔ پھسلن کے اوپر ایک سرخ تھیلی میں پانچ روپے رکھ کر تھیلی لٹکا دی جاتی تھی اور اعلان کر دیا جاتا تھا کہ جو چاہے پھسلن پر سے چڑھ کر تھیلی لے لے، لوگ پھسلن پر چڑھنے کی کوشش کرتے اور پھسل پھسل کر گرتے اس کا ایک تماشا ہی الگ ہوتا۔

میلے میں ایک طرف دو کانیں ہوتیں اور ایک طرف اکھاڑے بنائے جاتے جس میں بنوٹ، سیف، بانک، پٹے وغیرہ کے مظاہرے ہوتے اور میلے کے ختم پر مظاہرہ کرنے والوں کو فی اکھاڑہ پچاس پچاس روپیہ انعام نواب صاحب کی طرف سے دیا جاتا تھا۔

پھسلن کے قریب چار بیت کہنے والوں کی ٹولیاں رات دن دف پر چار بیتیں گاتیں انھیں سرکار سے کھانا ملتا تھا اور میلے کے ختم پر ہر ٹولی کو ایک ایک سو روپیہ انعام دیا جاتا تھا، داستان گو ایک طرف بیٹھے داستان سنایا کرتے انھیں بھی انعام مقرر تھا۔

مہمانوں کے لیے نفیس اور پر تکلف خیمے ڈیرے نصب کئے جاتے صاحبزادے، نواب زادے، امراء، اہل ثروت سبھی میلے کے زمانے میں ان میں آکر ٹھہر جاتے تھے۔ فوج اور پولیس کا معقول انتظام ہوتا اور تماشہ دیکھنے والوں کو ساری سہولتیں مہیا کی جاتیں۔

نہر کی دونوں طرف دو مہتابیاں تھیں ایک مہتابی رقص و سرور کے لیے اور ایک نماز کے لیے مخصوص تھی نماز کے وقت رقص و سرور قطعاً بند رہتا تھا۔ کلکتہ، دہلی بنارس لکھنؤ وغیرہ سے مشہور طوائفین اور فن کار آتے اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

میلے کے مقام کے بیچوں بیچ ایک عمارت قدیم شریف کے لیے ۱۲۸۷ھ میں بنادی گئی تھی۔ جس کی زیارت بڑی عقیدت اور تزک و احتشام سے کی جاتی تھی کوٹھی بدر منیر سے پنکھے کا جلوس بڑے اہتمام اور دھوم دھام سے لایا جاتا تھا۔ میلہ میں ہر قسم کے کھیل اور سپاہیانہ کرتبوں کے مظاہرے بڑے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے تھے، بخلاف اور میلوں کے اس میلے کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں نہ تو جوے کا پتہ رہتا اور نہ شراب کا۔ میلے کی آخری رات چراغاں کیے جاتے نہر میں بجرے پڑے ہوتے انھیں میں نواب صاحب بھی بیٹھتے اور رقص و سرور بھی ہوتا آتش بازی بڑی نفیس چھوڑی جاتی اور پانی میں لطفِ چراغاں دوبالا ہوجاتا۔

چار بیت رامپوری پٹھانوں کی محبوب چیز تھی جو اپنی رنج و مسرت دونوں کا اظہار اسی سے کیا کرتے تھے یہ ایک قسم کی آزاد نظم ہوتی تھی جس میں بعض دفعہ قافیہ اور ردیف بھی آجاتے مگر عموماً عروضی پابندی سے بے نیازی ہوتی یہ چار بیت ویسی ہی ہوتیں جیسے دکن میں منقبت بازی ہوتی تھی اس کا ایک نمونہ بھی دیکھ لیجیے۔

تم کو خدا نے کیا کلب علی خاں نواب
عرض اس ناچار کی سنئے ذرا اے جناب
کیسی یہ رونق ہوئی صحن گلستاں میں
کوٹھی اور کمرے سجے باغ کے درمیاں میں
صدہا جواں ہیں تیرے دید کے ارماں میں
دیکھ تو آنکھیں اٹھا لوٹ دے منہ سے نقاب
تم کو خدا نے کیا کلب علی خان نواب

سنکھے کا جلوس میلے کے آخری روز دھوم سے نکلتا تھا بالکل فوجی ٹھاٹ سے شتر سوار، پیدل، نوبت، نقارہ کے ساتھ ہاتھی پر جڑاؤ پنکھا نعت وصلواۃ کی گونج میں باقاعدہ جلوس کے ساتھ لیجایا جاتا اسی طرح جس طرح حیدرآباد دکن میں محرم میں لنگر کا اہتمام ہوتا تھا۔ ریاست کی ساری فوج معہ اپنے لوازمات اور اعزازات کے یکے بعد دیگرے گزرتی اراکین واعیانِ سلطنت جلوس کے ساتھ پیادہ پا چلتے اور تماشائی دوطرفہ صف باندھے مودب کھڑے رہتے۔

شبِ جشن میلے کی آخری رات ہوتی جو بڑی اہم ہوتی تھی۔ باغ کی روش روش تختے تختے پرٹٹیاں لگائی جاتیں اور ان ٹٹیوں پر لال ہرے اودے پیلے کاغذ اور ابرک کے قمقمے اور کنول روشن کئے جاتے جن کا عکس نہر کے پانی میں پڑ کر نہر میں آگ لگا دیتا نہر میں شاہی بجرا کھڑا ہوتا بجرے کی شہ نشین پر مخملی کارچوبی شامیانہ تنا ہوتا اور اس کے نیچے کارچوبی مسند بچھی ہوتی۔ بیچ میں گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا، رنگ برنگی قمقموں سے بجرا بقعۂ نور بنا ہوتا نواب صاحب رات کے دس بجے بجرے پر سوار ہوتے۔ نہر کے دونوں کناروں پر قطار باندھے ہندوستاں بھر کی طوائفیں اور گوئیے اور باکمال موسیقار ٹھہرتے جونہی نواب صاحب بجرے میں سوار ہو کر مسند پر براجمان ہوتے اور عمائدین ومصاحبین اطراف اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے رقص وغنا شروع ہوتا اس طرح دس بجے سے بارہ بجے رات تک بجرا نہر میں اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر گھومتا رہتا تھا۔ اور نہر کے دونوں طرف برابر رقص ونغمہ ہوتا یہ جنت نگاہ اور فردوس گوش منظر جب بارہ بجے ختم ہوتا تو پھر آتش بازی جلائی جاتی ٹٹیاں، چکر، قلعے اور کوٹھیاں جو نہر کے دونوں اطراف لگائے گئے تھے روشن کئے جاتے اور آب وآتش بہم دست وگریباں ہوجاتے۔

نواب صاحب رامپور نے بڑے بڑے فن دانوں کو جمع کیا تھا۔
داروغہ محبوب جان، لذت بخش، جنو، ممی، اللہ رکھی، ننی کلکتہ والی، عباسی، عزیزن،
ہنگنا جان، بندی جاں، امیر جان، امانی جان، جادی لکھنؤ والی جھمو، درباری
طوائفین تھیں۔

امیر خاں (بین کار) بہادر حسین (خاندان تان سین سے) باقر علی قوال
مودو (پکھاوجی) حیدر بخش (سارنگیا) حسو خاں سبّا (گویا) للو خان (گویا) رحیم
اللہ خاں، عظیم اللہ خاں (طبلچی) کاظم علی خاں (قوال) چھدا خاں (طبلچی) مندور
(سرنگیا) نثار علی، امیر علی (شہنائی نواز) ننھے خاں (معشوق ساز) مراد علی خاں،
علی جان (رقاص) نچکیا فن داں تھے۔ میلے میں یہ سب تو رہتے ہی تھے ان کے
علاوہ ہندوستان بھر کی طوائفین اور گویئے آجاتے تھے، بائیس سال تک یہ میلا بڑی
دھوم دھام سے ہوتا رہا آخری میلا خلد آشیاں نے شروع ہی کرایا تھا کہ ۲۳ مارچ
۱۸۸۷ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے مگران کے لائق جانشین نواب مشاق علی خاں
(عرش آشیاں) نے ۲۹ مارچ ۱۸۸۷ء کو میلہ میں شرکت کی اور میلہ ملتوی ہونے
نہ پایا۔

مشاق علی خاں نے بھی دو سال تک میلہ جاری رکھا اور پھر کونسل آف
ریذڑنسی کے زمانے میں بھی چند سال تک جاری رہا مگر بجائے باغ بے نظیر کے
کنیش گھاٹ پر منعقد ہوتا رہا اور بے نظیر کے میلے ہی کے نام سے موسوم رہا اس
کے بعد مدت تک یہ سلسلہ مسدود رہا بالآخر نواب رضا علی خاں بہادر نے
۱۹۴۲ء میں پھر اسی میلے کو نمایش کے نام سے جاری کیا جو اب تک جاری اور ہر
سال ترقی پر ہے۔

غالب کو بے نظیر کے میلے میں شریک نہ ہونے کا افسوس رہا چنانچہ انھوں نے ۱۴؍اپریل ۱۸۶۷ء کو بے نظیر کے میلے کے انعقاد کا اشتہار اخبار میں پڑھ کر نواب صاحب رامپور کو ایک عریضہ بھجوایا ہے جس میں میلے کی تاریخ بھی ہے عریضہ دلچسپ ہے اس لیے نقل کیا جاتا ہے۔

نمایش گاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں بالا خانے پر رہتا ہوں اُتر نہیں سکتا مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا کہار چلے میں نہ مرا رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھدی پالکی قفس اور میں طائر اسیر وہ بھی بے بال و پر نہ چل سکوں نہ پھر سکوں جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریق فرضِ محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کا کہاں مجال ہے بارے تین بیت کا قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں۔

نمایش گہے درخورشانِ خویش	برآراست نواب عالی جناب
بہ بیں چوطرب رانہایت نماند	بود سال آں بخشش بے حساب
خدایا پسند و خدا وند گار	کہ ازطبع غالب رود پیچ وتاب

بخشش بے حساب کے ۱۲۸۵ ہوتے ہیں بائے موحدہ ہے جب وہ نہ رہی تو دو عدد گھٹے اور ۱۲۸۳ رہ گئے فہو المقصود اگر حضرت کی مرضی ہو تو دبدبہ سکندری میں یہ تاریخ چھپوائی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس	ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
۱۴؍اپریل ۱۸۶۷ء	دیدار کا غالب

داغ اور امیر چونکہ رامپور ہی میں تھے اس لیے میلے سے لطف اندوز ہوتے ہی رہتے تھے۔ امیر کا شعر ہے۔

امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور
خبر ہے میلے میں اس مہ لقا کے آنے کی

مشہور ریختی گو جان صاحب نے مسدس بے نظیر کے نام سے ایک مسدس بڑی ہی نفیس کہی ہے جو میلے کی تمام تفصیلات پر حاوی ہے۔ اس مسدس کو بڑی عمدگی اور محنت سے ایڈٹ کر کے میرے مخلص میر محمد علی خاں، اثر رامپوری نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے جو اس میلے کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ مگر ۲۲ سال تک مسلسل میلا لگا کر خلد آشیاں اسے اتنا مشہور کر سکے کہ اور نہ مسدس لکھ کر جان صاحب نے اسے اتنی شہرت دی جتنی کہ داغ نے بے نظیر کے میلے کو لافانی شہرت دی ہے کیونکہ داغ نے میلے سے عاشقی شروع کی اور پھر اپنی مثنوی ''فریادِ داغ'' کہہ کر بے نظیر کے میلے کو لافانی بنا دیا۔

مارچ ۱۸۸۱ء میں جو میلا ہوا تو داغ اس میلے میں اس طرح کھو گئے اب انھیں کے زبان سے تفصیل سنئے۔

آ گیا بے نظیر کا میلا
دلِ پابند وضع کھل کھیلا

آفتِ جانِ ناتواں دیکھی
یک بیک مرگ ناگہاں دیکھی

جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا
سامنا ہوگیا قیامت کا

دیکھ کر اس پری شمائل کو
رہ گیا تھا تھام کر دل کو

دل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ ملا
آنکھ ملتے ہی پھر پتا نہ ملا

رنگ چہرہ سے اُڑ گیا کوسوں
دل سے میں مجھ سے دل جدا کوسوں

آبرو کا لحاظ و پاس کسے　　ہوش میں آؤں یہ حواس کسے
یار و غم خوار مونس و ہمدم　　کہہ رہے تھے تجھے خدا کی قسم
داغؔ! تو ماجرا بیان تو کر!　　تجھ کو کیا ہوگیا بیان تو کر!
کیوں ہے ایسا اداس خیر تو ہے!　　کیوں اڑے ہیں حواس خیر تو ہے!
سوچ اپنا برا بھلا دیکھو!　　دیکھو نواب میرزا! دیکھو!
شمع ساں جسم زار گھلتا تھا　　پر کسی پر نہ بھید کھلتا تھا
جستجو میں برے بڑے عیار　　نہ ہوا کوئی واقفِ اسرار
ہمنشیں و ندیم مضطر تھے　　سب طبیب و حکیم مضطر تھے
رنج سا رنج تھا حسینوں کو　　داغ سا داغ مہ جبینوں کو
منہ پہ ہر اک کے اشک بہتے تھے　　ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے
اس طرح کا فہیم و فرزانہ　　اے تری شان! یوں ہو دیوانہ!
اس کا قابو سے دل نکل جائے　　ہے غضب اس پہ چال چل جائے
یہ ہر اک فن سے خوب واقف تھا　　دوست دشمن سے خوب واقف تھا
ہم سمجھتے تھے ہوشیار اسے　　عشق میں آموزہ کار اسے
سینکڑوں رنگ اس نے برتے تھے　　نام سے اس کے عشق کرتے تھے
یہ وفا دار یہ خجستہ شعار　　صادق القول صادق الاقرار
کس نے بیہوش کردیا اس کو　　کس نے خاموش کردیا اس کو
کہیں آئی ہوئی طبیعت ہے　　چوٹ کھائی ہوئی طبیعت ہے
اک نظر دیکھ بھال کر کوئی　　لے گیا دل نکال کر کوئی
حال کیسا بدل گیا اس کا　　کیا کلیجہ نکل گیا اس کا

صلح کل ہے یہ آدمیت میں خیر سے شر نہیں طبیعت میں
خوش بیاں خوش زباں کہاں ایسا؟ فخر ہندوستاں کہاں ایسا؟
کس دغا باز نے اسے مارا؟ کس فسوں ساز نے اُسے مارا؟
کس قیامت نے پائمال کیا؟ سحر بنگالہ نے حلال کیا؟
وہ پری چہرہ کیا قیامت ہے داغؔ سے شخص کی یہ حالت ہے
اس بلا سے نکالنا اس کو یا الٰہی! سنبھالنا اس کو!

سنئے اب داغؔ اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کرتے ہیں۔

مجھ کو اس حال پر نظر ہی نہ تھی دین و دنیا کی کچھ خبر ہی نہ تھی
عشق نے تازہ روپ بدلا تھا میں بھی میلے میں اک تماشا تھا
میلے والوں میں دھوم تھی میری خوش جمالوں میں دھوم تھی میری
ہوش آیا تو میں نے کیا دیکھا؟ اک پری چہرہ خوش ادا دیکھا؟
رُخ سے ظاہر تھا نور کا عالم اور اس پر غرور کا عالم
جٹی جٹی بھوؤں کی وہ تحریر کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر
چشم خون ریز وہ فساد انگیز جس کا شاگرد فتنۂ چنگیز
گردن اس کی ہے وہ صراحی دار ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار
ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
نگہ مست ہوش یاری سے لڑنے والی چھری کٹاری سے
لب پاں خوردہ پر مسی کی دھڑی دل بیمار پر تھی رات کڑی
جوش پر بادۂ جوانی ہے یہی چاہ ذقن کا پانی ہے

سج دھج آفت غضب تراش خراش / کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش

وہ اٹکتی ہوئی نظر آہا / وہ لچکتی ہوئی کمر آہا

شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی / لن ترانی جواب میں کیسی

اُف رے عہد شباب کی مستی / بے پئے ہے شراب کی مستی

ہائے تیرا کلام مستانہ / ہائے تیرا خرام مستانہ

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا / ادھر آنا ادھر نکل جانا

کبھی منہ پر نقاب کاکل ہے / کبھی منہ پھیر کر تغافل ہے

کبھی سائے سے اپنے ڈر جانا / کبھی کچھ بانکپن بھی کر جانا

آئینے سے نگاہیں لڑتی ہیں / خود بخود چتونیں بگڑتی ہیں

کبھی کچھ تیوری میں بل دینا / کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

آئینے میں نظر چرا جانا / آپ اپنے سے شرم کھا جانا

اس قتالہ عالم کو داغ نے گانٹھ لیا اور۔۔

رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا / ہوتی رہتی کھلی دلی کیا کیا

جاں نوازی پر اس کو ناز بھی تھا / بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا

خانہ دوست عیش خانہ تھا / ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

عین وصل میں آہوئے وحشی بھڑک گیا۔۔

آگئی ہجر کی گھڑی سر پر / یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر

اس کے لب پر پیام رخصت کا / میرے دل میں مقام حسرت کا

قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا / رنگ بدلا نیا زمانے کا

حسرت آلود وہ نگاہیں تھیں / شرر آمیز میری آہیں تھیں

بات دل کی نہ لب تک آتی تھی
فکر میں آئی عقل جاتی تھی

مثل کاکل مجھے پریشانی
شکل تصویر اس کو حیرانی

سن کے رخصت کا نام روتے تھے
سب وہاں خاص و عام روتے تھے

ٹھہرے عہد وفا جو آپس میں
کھائیں باہم ہزار ہا قسمیں

رسم الفت کے ہوگئے اقرار
خط کتابت کے ہوگئے اقرار

شکر مہر و وفا کیا میں نے
بخشوایا کہا سنا میں نے

گو یا بندہ وفا کا بندہ ہے
آدمی پھر خطا کا بندہ ہے

اس نے مجھ سے کہا یقین مانو!
اک سرمو نہ فرق تم جانو!

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو
پر چلے ہیں قلق اٹھانے کو

ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں
اس کا واللہ کچھ خیال نہیں

زر سے معمور ہے ہمارا شہر!
کونسا دوسرا ہے ایسا شہر؟

ہے حکومت کی شان کلکتہ
سلطنت کا نشان کلکتہ

انتخاب زماں ہے کلکتہ
فخر ہندوستاں ہے کلکتہ

ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے
آدمیت کے ساتھ الفت کے

ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا
داغ سا آدمی نہیں ملتا

میری تسکیں اسے کئے ہی بنی
یہ تسلی مجھے دئے ہی بنی

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں
مر نہ جانا مری جدائی میں

جان سے چیز یوں نہیں کھوتے!
اس قدر پھوٹ کر نہیں روتے

جب کہ رنج و ملال ہوتا ہے
سچ ہے ایسا ہی حال ہوتا ہے

زندگی شرط ہے تو آئیں گے
لطفِ صحبت کے پھر اُٹھائیں گے

دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رام پور ہیں
یاد رکھنا ہمیں یہ یاد رہے — اسی صورت سے اتحاد رہے
مصرع میر پڑھ کے فرمایا — ''پھر ملیں گے اگر خدا لایا''[1]
وہ تو پہلو سے آہ بھر کے اُٹھے — اور ہم بے قرار ہو کے اُٹھے
جب وہ اک ایک سے چلے مل کر — خوب روئے مرے گلے مل کر
ادھر اس مہمان کی رخصت — تھی ادھر میر جان کی رخصت
ساتھ اس کے مری نگاہ گئی — جب نگاہ تھک گئی تو آہ گئی

جدائی کا صدمہ داغ کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا اس کی بڑی لمبی تفصیل لکھی ہے انتہا یہ کہ دماغ ماؤف ہو گیا تھا جسے اس طرح بیان کیا ہے۔

کوئی مہمان جو میرے گھر آیا — میں نے جانا پیامبر آیا
لیں بلائیں ہزار ہا میں نے — دیں دعائیں ہزار ہا میں نے
اس کو باتوں میں کھولتا تھا میں — خط کمر میں ٹٹولتا تھا میں
کبھی پیتا تھا پاؤں دھو دھو کر — کبھی ہنستا تھا خوب رُو رُو کر
کبھی قدموں پہ اس کے گرتا تھا — کبھی میں اس کے گرد پھرتا تھا
خبر یار پوچھتا تھا میں — حال اغیار پوچھتا تھا میں
رنگ کیا ہے امیدواروں کا — ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا
کونسے شخص پر عنایت ہے — رات دن کس سے گرم صحبت ہے
سنتے ہیں داستانِ غم کہ نہیں — یاد آتے ہیں اُن کو ہم کہ نہیں
کس سے ہر وقت ہم کلامی ہے؟ — کون سرکار کا سلامی ہے؟
بزم آرائیوں کا شوق بھی ہے؟ — اب وہ شعر وسخن کا ذوق بھی ہے؟

ہیں طبیعت میں ولولے کیا کیا؟ رات دن کے ہیں مشغلے کیا کیا؟
میہماں سن کے یہ مری تقریر تھا تحیّر میں صورتِ تصویر
اس کو حیرت یہ ماجرا کیا ہے؟ میزباں کو جنوں ہے سودا ہے!
میری حالت پہ اس کو سکتا تھا شکل آئینہ منہ کو تکتا تھا
نظر آئی جو اس کی حیرانی سخت مجھ کو ہوئی پشیمانی
کون مہمان ہو کے آئے گا یوں تلاشی جو دے کے جائیگا

اس طرح ۱۸۸۱ء ختم ہوگیا اور ۱۸۸۲ء شروع ہوا اور داغ نے حجاب کو بے نظیر کے میلے کی دعوت دی اور بڑی وقت سے رامپور بلایا اور مارچ ۸۲ء میں حجاب دوبارہ رامپور پہنچ گئیں۔

جا کے عہد شباب کا آنا! تھا دوبارہ حجاب کا آنا!
کیا مرے دلستاں کا آنا ہے یہ تو روحِ رواں کا آنا ہے
نگہت گل ادھر پلٹ آئی عمر رفتہ مگر پلٹ آئی
تھا یہ اس رشک حور کا آنا چشم اعمیٰ میں نور کا آنا
تھا یہ اس گلعذار کا آنا یا نسیم بہار کا آنا
پھر وہی ساعتِ سعید آئی کہ برس دن کے بعد عید آئی

مگر اس کے ساتھ ہی لوگوں نے درانداز یاں کیں حجاب کو بھڑکا یا دس پندرہ روز تک وہ علیحدہ رہیں مگر پھر داغ نے لبھالیا اور۔

گزری اوقات عیش وعشرت سے دو مہینے تک ایک صورت سے
مگر آہوئے وحشی کب تک ایک جگہ ٹکتا پھر بھڑک گیا اور۔

بولے میری بلا قفس میں رہے آدمی کیوں پرائے بس میں رہے۔

قید خانہ ہے رامپور مجھے — جلد رخصت کریں حضور مجھے

اس طرح

دم دلا سے وہ مجھ کو دیکے گئے — مجھ سے آنے کا عہد لے کے گئے

داغ کی قسمت سے کلکتہ میں بھی حجاب کو بھڑکانے والے پیدا ہو گئے اور انھوں نے شہ دی کہ داغ کو کلکتہ بلاؤ چنانچہ حجاب نے بلوایا۔

رسم الفت نباہتے ہو اگر — جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اُٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ — کوئی روکے مگر چلے آؤ!
ریل میں اتنی دور آنا کیا — کار سرکار کا بہانا کیا
ہم بلائیں نہ آئیں آپ چہ خوش — اور اس پر رہے ملاپ چہ خوش؟
یہ جگہ سیر گاہِ عالم ہے! — آج اس پر نگاہ عالم ہے!
میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں — عیش وعشرت کے لطف باہم ہوں

بھلا طلبی ہو اور داغ نہ جائیں یہ کیسے ممکن ہوتا مجبوراً رخصت لی۔

مل گئی جب حضور سے رخصت — میں ہوا رام پور سے رخصت
کہہ کے اٹھا خیر یا قسمت — راہرو میں تو رہنا قسمت

رام پور سے سیدھے دہلی گئے۔

جا کے اپنے وطن میں جی نہ لگا — اس بنائے کہن میں جی نہ لگا
چل کے دلی سے لکھنو پہنچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا

لکھنؤ میں سید بہادر حسین انجم نیشاپوری تھے جو داغ کے راز دار دوست تھے اس لیے انھیں کے گھر قیام کیا۔

بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے — مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے

کچھ جو ارمان تھا نکال لیا　　شہر کو خوب دیکھ بھال لیا
خوب انجم نے نے میہمانی کی　　اور بھی سب نے مہربانی کی
راہ میں کانپور الہ آباد　　میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آگیا عظیم آباد　　تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

عظیم آباد میں داغ کا خیر مقدم بڑی دھام دھام سے ہوا۔

پیشوائی کے واسطے احباب　　آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے　　اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لیے ہی جاتا تھا　　کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا میرے گھر چلئے　　آیئے اس طرح ادھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا　　رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے　　میرزا[1] شاغل آئے جب وہ ہٹے
یہ وہ ہیں نام خلق ہے جن سے　　آدمیت مراد ہے ان سے

میرزا شاغل آغا تراب علی کے بیٹے اور داغ کے اخیافی بھائی تھی ابتداً رامپور میں رہے پھر عظیم آباد میں قیام کیا تھا جن دنوں داغ وہاں پہنچے ہیں۔ مرزا شاغل کی مستقل سکونت وہیں تھی اور انھوں نے ہی داغ کی میزبانی کی تھی چونکہ ان کے مسکونہ مکان میں گنجائش کم تھی اس لیے داغ کو اپنے دوست میر باقر کے مکان میں ٹھہرایا تھا۔

داغ عظیم آباد میں بہت مقبول تھے ایک تو یوں ہی ان کی شہرت وہاں تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ مرزا شاغل وہاں داغ کا چرچا کرتے رہتے تھے۔ شاعری اور شطرنج کا بہت شوق تھا عظیم آباد میں محلّہ گرہٹہ میں میر محمد باقر کے مکان کے

قریب رہتے تھے میر باقر عظیم آباد کے قدیم خاندانی بزرگ تھے شاعری میں وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا خوش نویس تھے اور شطرنج کے دلدادہ اسی ذوق کی وجہ سے مرزا شاغل سے دوستی اور یک جہتی ہوگئی تھی اور باقر ہی کے مکان پر زیادہ نشست رہتی تھی۔ داغ نے کلکتہ جاتے ہوئے عظیم آباد ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مرزا صاحب نے خوب تشہیر کر دی سارے عظیم آباد میں داغ کی آمد کی اطلاع ہوگئی اور لوگ جوق در جوق اسٹیشن پہنچ گئے۔ بیشتر رئیس اپنی اپنی سواریاں لے کر اسٹیشن پہنچے تھے کہ داغ کو ہم اپنا مہمان بنائیں گے اور ہر شخص کو اصرار تھا کہ داغ میرے مہمان ہوں داغ حیران تھے کہ کس کی مہمانی قبول کریں کہ اتنے میں مرزا شاغل پہنچے اور انھوں نے سب کو سمجھا منا کر داغ کو اپنے ساتھ لے کر گڑ ہٹھ کا رخ کیا اور وہاں لاکر میر باقر کے مکان میں ٹھہرایا۔

داغ کے عظیم آباد پہنچنے سے پہلے ہی وہاں کے محلّہ مغلپور کے ایک رئیس نے مشاعرہ مقرر کیا تھا اور طرح دی تھی۔

آباد کبھی خانۂ ویراں نہیں دیکھا!

اتفاق سے جس روز داغ پہنچے ہیں اسی رات مشاعرہ تھا اور بانی مشاعرہ خود سواری لے کر داغ کے پاس پہنچے کہ مشاعرے میں چلئے یا تو یہ اتفاق تھا یا وہ داغ کا امتحان کرنا چاہتے تھے۔ داغ نے انھیں کے سامنے بیس پچیس شعر کہہ لئے اور راستہ چلتے چلتے بھی دس بارہ شعر کہہ دئے اس طرح مشاعرہ میں پہنچ کر بڑی سیر غزل پڑھی جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا۔

اس خانۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا
اس بت کو کب اللہ کا مہماں نہیں دیکھا

کیا پوچھتے ہو کون ہے کس کی ہے یہ شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

داغ کے خیر مقدم میں پہلا مشاعرہ میر باقر نے کیا اور اپنے استاد کی غزل کا مصرع طرح کر دیا، مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے داغ نے غیر طرحی غزل پڑھی جس کے دو شعر یہ تھے۔

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے
ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

کھاتے ہیں داغ دوست مرے دل کے داغ سے
سچ ہے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

طرحی غزل میں داغ نے دھوم مچادی خصوصاً جب یہ شعر پڑھا تو سارا مشاعرہ داد کے نعروں سے گونج اٹھا اور دس دس بار لوگوں نے پڑھوایا۔

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہاتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

اس طرح میں داغ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

عظیم آباد والوں نے ایک اور مشاعرہ بھی داغ کے خیر مقدم میں کیا تھا۔ جس میں طرحی غزل داغ نے پڑھی مقطع تھا۔

طور کے پہلو میں اک بتخانہ ایسا چاہیے
شور اُٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہیے

داغ کے پہنچتے ہی میر باقر کا مکان تماشا گاہ بن گیا سارا عظیم آباد امڈ آیا ہر شخص داغ سے آ کر ملتا غزل سنتا کوئی اپنی غزل سناتا کوئی شاگرد ہوتا اس طرح داغ نے نہایت مصروف ایام بسر کئے بعض لوگوں کی بازدید کے لیے بھی داغ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ داغ نے عظیم آباد میں خانقاہ ابوالعلائیہ محلہ شاہ املی کے سجادہ نشین شاہ یحییٰ صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ شاہ صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق تھا ہر واقعہ کی تاریخ کہا کرتے تھے عظیم آباد میں داغؔ کی آمد کی تاریخیں بھی کہیں۔

جناب داغ در شہر من آمد رسیدند آرزومنداں زہر سو
بہ لوحِ دہر تاریخ قدومش رقم کردم قدوم داغ حق گو
۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲

دیگر

جناب داغ عالی جاہ آمد در عظیم آباد
مثال گل بہار افزائے دل چو ماہ نور افشاں
ہمیں تاریخ مصراع از درونِ من بروں آمد
رسیدہ مرہم دلہائے رنجوراں انیس جاں
۱۲۹۹ھ

دیگر

یکتائے زمانہ داغ خوش خو در ملک سخنوری بود شاہ
در وصف کمال آں سخنور دامانِ دراز نظم کوتاہ
امروز بہ ارضِ ہند مثلش نبو دیک فرد بعلم اللہ

در پٹنہ برائے سیر آمد　　نور افشاں نور پاش چوں ماہ
شد طبع نیاز مند مسرور　　از دیدن آں یگانہ دلخواہ
تاریخِ قدوم اگر پر سند　　گو مقدم داغ صاحب جاہ

۱۲۹۹ھ

عظیم آباد والوں نے جس گرم جوشی سے داغ کا استقبال کیا اور جس خلوص اور محبت سے خوش آمدید کہا اس سے داغ بہت متاثر ہوئے کیونکہ اس وقت تک داغ کو اتنی ہر دل عزیزی کہیں نصیب نہیں ہوئی تھی یہ دراصل مرزا شاغل اور ان کی پارٹی کا اہتمام تھا جو داغ اتنے مقبول ہوئے اس کا ذکر مثنوی میں داغ نے اس طرح کیا ہے ؎

متقی پارسا بہت دیکھے　　خوش بیاں خوش ادا بہت دیکھے
خوش گلو بھی کئی سنے میں نے　　خوبرو بھی کئی چنے میں نے
مجھ کو فرصت ملی نہ یاروں سے　　روز ملتا تھا میں ہزاروں سے
ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی　　یہ مروّت کہیں نہیں دیکھی
کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں　　کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں
اُن کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو　　اُن کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو
دیں وہ مہماں کو جس قدر چاہیں　　بخش دیں گھر کا گھر اگر چاہیں
میر باقر کے گھر قیام ہوا　　خوب دعوت کا اہتمام ہوا

قیاس یہ چاہتا ہے کہ داغ اوائل اپریل میں رامپور سے نکل کر دہلی لکھنؤ وغیرہ گھومتے ہوئے اور آخر اپریل ۱۸۸۲ء میں عظیم آباد پہنچے ہیں کیونکہ انھوں نے ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد سے نواب بہادر علی خاں انجم نیشاپوری کو ایک خط لکھا جس

میں لکھتے ہیں:

”میں بخیر و عافیت وارد عظیم آباد ہوا، محلّہ گڑہٹا مکان سید باقر صاحب میں مقیم ہوں، چار روز ہوئے کہ وہ کلکتہ روانہ ہو گئے سید قطب الدین کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں ....اہل عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر و عزت کی ہے جس کی حد نہیں، کلکتے میں جاتے دیتے میری طبیعت علیل ہے، سرکار میں خط بھیجا ہے ان کے جواب کا منتظر ہوں“۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے جنھیں ”وہ“ لکھا ہے اور جن کے ساتھ قطب الدین گئے ۲مئی ۱۸۸۲ء کو پٹنہ سے کلکتہ گئے ہیں چونکہ ”وہ“ داغ کے ساتھ ہی ساتھ عظیم آباد پہنچے تھے اس لیے قیاس یہی ہے کہ اواخر ماہ اپریل ہی میں یہ لوگ پٹنہ پہنچے ۲ جون ۱۸۸۲ء کو ایک عرضی نواب صاحب رامپور کی خدمت میں بھیجی ہے کہ:

”فدوی بصرورت چند در چند از ہفتہ وارد عظیم آباد پٹنہ گشتہ است و از اں جا قصد کلکتہ نیز می دارد۔ لہٰذا امید وارم کہ از راہ غریب نوازی رخصت دو ماہ دیگر مرحمت شود“۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس خط کی نقل لیتے وقت نقل نویس نے بصرورت چند در چند از ہفتہ والی عبارت کی نقل میں غلطی کی ہے کیونکہ داغ کا قیام اس خط کے لکھتے وقت ایک مہینے کا ہو چکا تھا۔ یعنی اگر انھیں ۲مئی کو بھی عظیم آباد پہنچنے والا مان لیں تو ۲ جون کو ایک مہینہ ہوا، اس طرح داغ نے خواہ مخواہ مدت کیوں گھٹا دی ممکن ہے کہ انھوں نے لکھا ہو ”بصرورت چند از چند ہفتہ، نقل نویس

نے چنداز چند کو چند در چند لکھا دیا اور اس کے بعد از کا اضافہ کر دیا ہو، مگر دل لگی یہ ہے کہ خود داغ نے مثنوی میں لکھا ہے۔

آٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی
یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی

اور پھر اپنی سوانح حیات جو احسن مارہروی سے مرتب کرائی ہے اس میں بھی ''اثنائے سفر میں آٹھ روز پٹنے عظیم آباد میں بھی مقیم رہے'' لکھوایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی ضرورتِ خاص کی وجہ سے داغ نے نواب صاحب کو ''از ہفتہ'' لکھا ہے اور چونکہ ایک دفعہ پٹنہ میں ایک ہفتہ قیام ظاہر کر چکے تھے اس لیے مثنوی میں بھی آٹھ دن کہا اور جلوۂ داغ میں بھی آٹھ روز لکھوائے ورنہ داغ نے پٹنہ میں ایک مہینے سے زیادہ قیام کیا ہے یا بہت ممکن ہے کہ یہ آٹھ دن محاورے کے آٹھ دن ہوں جس طرح کہ ہندوستاں میں کل کہا جاتا ہے۔ یعنی غدر ۵۷ کو یہی لوگ کل کی بات ہے کہہ دیتے ہیں اور دکن میں اسی معنی میں پرسوں مستعمل ہے۔

داغ کا مئی میں عظیم آباد پہنچنا مسلم ہے اور وہاں پر رہ کر ساون کا انتظار کرنا بھی مسلم ہے چنانچہ مشاعرے میں داغ نے یہ شعر پڑھا ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلا جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

چنانچہ عظیم آباد کی گرمی کا ذکر داغ نے مثنوی میں یوں کیا ہے۔

کیا قیامت تھی شہر کی گرمی — کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آب میں گرمی — مثل اخگر حباب کی گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہو عاری — جائے نوری وہاں تو ہو ناری

بے جلے کوئی استخواں نہ رہے — عنصر آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل — جل گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنور طوفاں بھی — کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی
رنگت آخر تپش سے زرد ہوئی — گرمی طبع داغ سرد ہوئی
سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا — دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا

بہار میں ماہِ جون کے وسط میں مون سون شروع ہوتا ہے۔ ۱۴ جون کے بعد مون سون شروع ہوا اور چھینٹا پڑا یعنی ساون رُت آئی تو داغ نے کلکتہ کا قصد کیا اس طرح ہم یقین کرتے ہیں کہ داغ نے پورا ماہ مئی اور آدھا جون عظیم آباد میں گزارا ہے۔ اس طرح داغ وسط ماہ جون میں کلکتہ روانہ ہوئے اب اس سفر کا حال انھیں کی زبان سے سنئے۔

سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا — دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا
شوق بے اختیار لے ہی گیا — یہ دلِ بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
ریل پر دوستانِ نیک خصال — آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا — داغ آیا تو باغ باغ آیا!
دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں — ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں
سر بازار وہ مکان بلند — جس کو کہئے اک آسمان بلند
چرخ کو رتبہ اس مکان سے کہاں — دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں
شرم و غیرت سے چھپ گئی جنت — ورنہ یہ قصر دیکھتی جنت
ہم جو بالائے بام رہتے تھے — لوگ عالی مقام کہتے تھے

سامنے ناخدا کی مسجد تھی ناخدا کیا؟ خدا کی مسجد تھی!
مظہرِ نور ہے یہی مسجد بیت معمور ہے یہی مسجد

داغ نرے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاس اور زمانہ ساز آدمی تھے۔ یہ سفر یوں تو انھوں نے بہ سلسلہ عاشقی کیا تھا مگر اسی کو انھوں نے وسیلۂ ظفر بھی بنایا ابتداً مرزا شاغل کو اپنی آمد کی اطلاع دے کر عظیم آباد میں اپنی آمد کی تشہیر کرائی اور شاغل نے بھی وہ پبلسٹی کی کہ عظیم آباد میں داغ کا نہایت شاندار استقبال ہوا، یہاں پہنچ کر استقبال کے رنگ دیکھ کر اپنے چند آدمیوں کو جن کے ساتھ قطب الدین بھی تھے ۲ مئی کو کلکتہ بھجوا دیا تا کہ وہ لوگ وہاں پہنچ کر زمین ہموار کریں اور داغ کا سواگت خاطر خواہ ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر کلکتہ بڑا شہر تھا عظیم آباد کی طرح وہاں ہنگامہ تو نہ ہو سکا پھر بھی استقبال نہایت ہی شاندار ہوا اور داغ کے لوگوں نے جو مکان ناخدا کی مسجد کے سامنے کرایہ پر لیا تھا اس میں داغ ٹھہر گئے۔

نگار کے داغ نمبر میں اور اس کے بعد دو ایک مضامین داغ کے سفرِ عظیم آباد سے متعلق طبع ہوئے ہیں جن سے ہمیں تاریخی قطعاتِ خیر مقدم مل سکے۔ مگر داغ کے سفر کلکتہ اور قیام کلکتہ سے متعلق کچھ مواد ہی نہیں مل سکا مثنوی فریادِ داغ کے علاوہ جلوۂ داغ کی چند سطریں اس سفر پر روشنی ڈالتی ہیں اس کے سوا کچھ نہیں جلوۂ داغ کی عبارت ہم نقل کئے دیتے ہیں۔

”کلکتے میں ناخدا کی مسجد کے سامنے آپ (داغ) ٹھہرے تھے اور جب تک وہاں رہے برابر مشاعرے ہوتے رہے ایک مشاعرہ تو لوگوں نے آپ ہی کے مکان پر کیا تھا جس میں مٹیا برج کا خاندانِ شاہی اور بہت سے ملازمان و عمائدین خاندانِ شاہی

محض آپ کی خاطر سے شریک ہوئے اور اسی طرح مختلف
مقامات شہر میں مشاعرے ہوا کئے برابر آپ کے قیام تک وہاں
یہ کیفیت رہی کہ روزانہ صبح وشام بیسوں اور سینکڑوں نئے مشتاق
روسا اور عمائدین آپ سے ملنے کے لیے آتے تھے''۔

داغ نے جلوۂ داغ میں اپنی ایک بدحواسی بھی لکھوادی ہے کہ عبدالرزاق نامی کسی شخص نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں مشاعرہ کیا اور بجائے قبل از مشاعرہ دعوت یا طرح بھیجنے کے مشاعرے ہی کی رات داغ کے پاس پہنچ کر مشاعرے میں چلنے کے لیے مجبور کیا اور داغ نے بھی اس کے ساتھ جاکر مشاعرے میں شرکت کی چونکہ داغ نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی اس لیے انھوں نے صاحب مشاعرہ سے خواہش کی کہ مجھے کسی کمرے میں تھوڑی دیر تک ٹھہرنے دو تا کہ میں غزل کہہ لوں چنانچہ صاحب مشاعرہ نے داغ کو ایک کمرے میں لیجا کر بٹھا دیا اور داغ غزل کہنے میں محو ہو گئے اتفاق سے پٹنے سے دو عدالتی عہدہ دار جو بزرگ صورت اور سفید لباس میں ملبوس تھے مشاعرے میں پہنچے اور انھوں نے داغ کو ڈھونڈا تو صاحب مشاعرہ نے انھیں کمرے میں پہنچا دیا جہاں داغ غزل کہنے میں محو تھے یہ دونوں بزرگ کھڑے ہوئے داغ کی محویت کو دیکھ ہی رہے تھے کہ یکا یک داغ کی نظر اُن پر پڑی داغ چونکہ خالی الذہن تھے اور دو فرشتہ صورت بزرگ سامنے کھڑے ہوئے تھے اس لیے بے ساختہ داغ کے منہ سے نکلا:

''ہیں! ابھی سے یہ منکر نکیر کہاں سے آگئے؟ میں ابھی زندہ ہوں'' داغ کی بدحواسی پر دونوں بزرگ مسکراتے ہوئے مجلس مشاعرہ میں واپس چلے گئے۔

داغ کی غزل جس کا یہ شعر ہے کلکتہ ہی کے کسی طرحی مشاعرے کی ہے۔

اک چشمۂ حیواں ہے تو اک چشمۂ کوثر دو قطرے ہیں آبِ دمِ شمشیر سے باہر

داغ نے یہ شعر بھی کلکتہ ہی کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔

یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا

داغ نے اپنے قیامِ کلکتہ کے زمانہ میں سینکڑوں سے دوستی کر لی تھی اور ہزاروں آدمیوں سے ملاقات کی تھی اور پھر عاشقی کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا اس کا لطف انھیں کے زبان سے سن کر اٹھا لیجیے۔

بخت بیدار و یار ہے دمساز اے شبِ وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف شام سے صبح تک وصال کے لطف
غم کی راتیں نہ تھے ملال کے دن کیا پھرے تھے شبِ وصال کے دن
وصل کی شب میں جلوے تھے دن کے سرمہ تھا حلق میں موذن کے
عیش وعشرت کی بات بات اچھی رات سے دن تو دن سے رات اچھی
محفلِ عیش کا بندھا وہ سماں دیکھے پھر پھر کے جس کو عمرِ رواں

یہ تو ہم نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ داغ نے ساون رُت شروع ہونے کے بعد کلکتہ کا قصد کیا تھا اس لیے وہ ساون کا لطف کلکتہ میں اٹھاتے رہے۔

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
آتشِ حسنِ یار کی گرمی بزم میں اک بہار کی گرمی
گرچہ اکثر ہوا جنوبی تھی پر وہ عطرِ حنا میں ڈوبی تھی
چاندنی کے تمام شب جلسے دلکشا سقف پر عجب جلوے
یاد ہے ایک رشکِ گل کی سیر چودھویں رات کو وہ پُل کی سیر

کلکتہ کے لوگوں کی تعریف یوں کی ہے۔

لوگ سب خوش قماش خوش ترکیب　　اہل تمیز و صاحبِ تہذیب
ہم سے سرگرم اتحاد رہے　　عبدِ رزاق شاد شاد رہے
دوست با وضع ہے کہاں پیدا　　داغ اس وضع دار کا شیدا

یہ لطفِ عیش جاری ہی تھا کہ رامپور سے داغ کی طلبی ہوئی۔

میری رخصت کے دن تمام ہوئے　　عیش وعشرت کے دن تمام ہوئے
جلد حاضر ہو یہ پیام آیا　　اور سر پر مہِ صیام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا　　دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح سے رہ جاتے　　ہوئے باؤں برس نمک کھاتے
دل خدا نے دیا غیور بہت　　تھا یہ پاسِ نمک سے دور بہت
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے　　تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

اس ختم رخصت کے ذکر سے ہماری رائے کو اور تقویت ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے ۶/اپریل ۱۸۸۲ء سے دو مہینے کی رخصت ۵/جون تک لی تھی اور پھر کیم جون کو عظیم آباد سے "رخصت دو ماہ" دیگر کی درخواست بھجوائی تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ دو مہینے کی مزید رخصت منظور نہ ہوئی صرف ایک مہینے کی رخصت منظور ہوئی جو ۵ جولائی ۱۸۸۲ء کو ختم ہونے والی تھی رامپور سے یہ اطلاع آئی ہوگی کہ آپ کو مزید ایک مہینے کی رخصت منظور ہوئی ہے جو ماہ جولائی کو ختم ہو جاتی ہے۔ اختتام رخصت پر حاضر ہو جایئے اس اطلاع سے پریشان ہو کر داغ نے واپسی کا قصد کیا چنانچہ داغ نے جب حجاب سے واپسی کا ذکر کیا تو

میری رخصت سے اُن کو حیرت تھی | کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی
فکر تشویش رنج تھا غم تھا | عرضِ نغمہ شورِ ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے | پاس بیٹھے تو منہ بنائے ہوئے
وہ جو گھبرائے میری اُف اُف سے | تو یہ کہنے لگے تاسف سے
چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ | ورنہ ہو لیتے ہم تمہارے ساتھ
ہم عزیزوں کو چھوڑ دیں کیونکر | سلسلہ اُن سے توڑ دیں کیونکر؟
تم بھی تنہا نہیں ستم یہ ہے | چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے
جو مرے پاس ہے تمہارا ہے | تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے
میں نے کی اختیار خاموشی | مجھ سے کب ہو نمک فراموشی

بہرحال بصد حسرت و یاس داغ نے ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتہ چھوڑا۔

اہلِ صحبت کو داغ دیکے چلے | اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے
کیا کہیں جس طرح سے ہم آئے | ہمہ تن حسرت و الم آئے
میرے ہمراہ میر قطب الدین | اشک ریزاں بحالتِ غمگیں
میری غمخواریوں سے کام انھیں | میری دلداریوں سے کام انھیں
وہ مرے دل کو اس طرح لائے | کوئی گھائل کو جس طرح لائے
کچھ نہ تھی مجھ کو جسم و جاں کی خبر | نہ زمیں کی نہ آسماں کی خبر
ریل نے دو ہی میں پہنچایا | رمضاں ایک دن کے بعد آیا
دست بستہ حضور میں پہنچا | بزم عیش و سرور میں پہنچا

جنتری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ جولائی ۱۸۸۲ء کو غرہ رمضان ۱۲۹۹ھ تھا اس لیے ہم نے یہ تعین کیا ہے کہ داغ ۳ جولائی کو کلکتہ سے چلے دو دن

ریل میں رہے ۶ جولائی ۱۸۸۲ء کو تین مہینے کے بعد بخیر وخوبی داغ واپس ہوئے۔ رامپور پہنچ کر داغ پھر آتشِ فراق میں جلنے اور ہائے وائے کرنے لگے چنانچہ مثنوی کا آخری حصہ اسی داستانِ فراق پر مشتمل ہے بالآخر مثنوی کو یہ کہہ کر ختم کیا ہے۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

اس طرح (۸۳۸) اشعار کی یہ مثنوی داغ نے اسی حالتِ فراق میں ۱۸۸۲ء میں کہی ہے جو ۱۸۸۳ء میں چھپی ہے۔ یہ معلوم کر کے لوگوں کو حیرت ہوگئی کہ یہ مثنوی داغ نے صرف دو دن میں کہی ہے چنانچہ جلوۂ داغ میں احسن سے داغ نے لکھوایا ہے۔

''زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریادِ داغ جیسی بے مثل مثنوی صرف دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے''۔

داغ نہایت زود گو تھے یہ بالکل صحیح ہے کہ انھوں نے دو دن میں مثنوی کہی ہوگی کیونکہ حیدرآباد میں باتیں کرتے کرتے وہ دو تین غزلیں لکھوا دیا کرتے تھے اُن کے لیے دن بھر میں چار سو شعر کہہ لینا وہ بھی مثنوی کی بحر میں کوئی مشکل نہ تھا۔

مثنوی فریادِ داغ کو اب تک بہت کم لوگوں نے پڑھنے کی کوشش کی ہے نوے فی صد شیدائیان اردو فریادِ داغ کے نام سے واقف اور مختلف مقامات سے مثنوی کے نقل شدہ اشعار سے روشناس ضرور ہیں مگر کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے

مثنوی کو شروع سے آخر تک پڑھا ہو، نقادوں میں شاید رام بابو سکسینہ (یا ان کے کتاب کے مترجم مولوی عسکری) ہی ایک ایسے ہیں جنھوں نے مثنوی فریاد داغ کو پوری طرح پڑھا اور سمجھا ہے چنانچہ سکسینہ نے لکھا ہے۔

''مثنوی فریادِ داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی منی بائی حجاب کے ساتھ اُن کو تھا رامپور کا بے نظیر کا میلا دیکھنے کی غرض سے آئی تھی ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی وعمدگی ان کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کی تصویر سے معشوق کا تخاطب نہایت دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں''۔

(تاریخ ادب اردو مولفہ سکسینہ مترجمہ عسکری مطبوعہ نولکشور ص:۴۳۱)

علامہ سر عبدالقادر نے لاہور کے ایک انگریز ماہنامے نیو اور ینٹ بابتہ ۱۹۲۶ء میں داغ پر ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا اس کا ترجمہ میں نے ماہنامہ شمع آگرہ بابتہ ۱۹۲۶ء میں کیا ہے اس مضمون میں علامہ نے مثنوی فریادِ داغ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے ملاحظہ ہو۔

''فریادِ داغ ایک مسلسل نظم یا مثنوی ہے جس میں داغ نے خود اپنی زندگی کا ایک واقعہ نظم کیا ہے۔ یہ واقعہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب داغ ایک مغنیہ (طوائف) پر عاشق ہو جاتے ہیں جو صرف معمولی موسیقی کی ماہر ہی نہیں ہوئی بلکہ تعلیم یافتہ اور ادبی

مذاق رکھنے والی بھی ہوئی ہے اور حجاب تخلص کرتی ہے۔ اس مثنوی
سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی"
اس میں کوئی بات عجیب وغریب اور غیر فطری نہیں ہے ایک جلسہ
رقص و سرود میں داغ اور حجاب ایک دوسرے سے بے حجاب
ہو جاتے ہیں اور داغ اپنے دل پر اس کی مفارقت کا ایک دائمی
نقش پاتے ہیں اس کی راگنی داغ نے "فریاد" کی "لے" میں
الاپی ہے اور یہ راگ اس قدر صاف اور واضح طور پر الاپتے ہیں
کہ کوئی شخص بھی سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا، وہ صاف طور پر اس
بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ حجاب نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اُن کی
سیہ فامی کے باوجود ان کی شاعری کی وہ مداح اور شیدا ہے چونکہ
داغ نہ تو خوش رو تھے اور نہ نوجوان اس لیے کوئی نازنین اُنکو محبت
کی نظر سے کیوں دیکھتی؟ واقعہ یہ ہے کہ حجاب ان کی ظاہری شکل
و شباہت پر نہیں بلکہ اُن کی شاعری نام آوری اور دولت پر مٹی
ہوگی مگر ان دونوں کی یکجائی بہت جلد ختم ہوگئی کہا جاتا ہے کہ حجاب
سن رسیدہ ہو جانے کے بعد داغ سے ملنے کے لیے آئی جبکہ داغ
ستر برس کے ہو چکے تھے اس قصے کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے میں
نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ایسی بات ہے جس پر سوانح نگار کو شرمندہ ہونا
پڑے، مثنوی جو اس قصے کو ظاہر کرتی ہے بڑی پر لطف ہے۔ داغ
اس قصے کو اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل لوٹ جاتا ہے۔
ہر شعر حشر جذبات اور وارداتِ قلبی کا نچوڑ ہے وہ اشعار جن میں

داغ محبت کا اظہار کرتے ہیں اس قدر پر لطف ہیں کہ ان کے خلوص زور اور صداقت کے لحاظ سے بمشکل ان کے کسی ہمعصر کو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں اس مختصر مضمون میں "فریاد" کی شاعرانہ خوبیوں کی تشریح پوری طرح کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں کو جنھوں نے اس مثنوی کو اب تک نہیں پڑھا ہے میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ضرور پڑھیں اور اس کے محاسن کے متعلق خود اپنی رائے قائم کریں میری رائے میں اس مثنوی کا ادبی مقام بہت بلند ہے اگر چہ داغ نے چار ضخیم دیوان چھوڑے ہیں مگر صرف یہ مثنوی ہی ان کے بقائے دوام کے لیے کافی ہے"۔

میں نے ہندوستان کے دو بڑے نقادوں کی رائے نقل کر دی ہے ایک تذکرۂ شعراء اردو اور تاریخ ادبیات اردو کے مصنف اور جو ادبی حیثیت سے بڑے قابل ہیں دوسرے سرخیلِ زندہ دلانِ پنجاب ڈاکٹر سر اقبال کو عوام سے روشناس کرانے والے اور مخزن جیسے بلند پایہ مجلّے کے اڈیٹر اور ہندوستان کے مانے ہوئے فاضل ادیب تھے ان دونوں کی رائے کے بعد کسی اور کی رائے کے اظہار کی مطلق ضرورت نہیں۔

یہ تھا مثنوی فریادِ داغ کا پس منظر اور اس کی تشریح و توضیح، آپ حیران ہوں گے کہ حجاب کون تھی؟ بیشتر لوگ اسی ادھیڑ پن میں ہیں بیسیوں مضمون نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ یہ تحقیق طلب ہے کہ حجاب پہلے سے شعر کہتی تھی یا داغ کی صحبت میں رہ کر شعر کہنے لگی۔ تذکرہ بہارستانِ ناز کے مولف نے حجاب کا حال اس طرح لکھا ہے۔

''منی بائی کلکتہ کی رہنے والی، ایک چھوٹا سا دیوان بھی ترتیب دیا ہے۔ سلامتی سے عمر میں ابھی اُنیسویں سال کی گرہ پڑی ہے منشی شوکت علی صاحب سے کچھ مشقِ سخن بڑھائی ہے''۔

دل میں جگر میں سینے میں پہلو میں آنکھ میں
اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں
دیتے ہیں چھیڑ چھیڑ کے کیوں مجھ کو گالیاں
سمجھے ہوئے ہیں وہ مرے منہ میں زباں نہیں
برا کیا جو کہا اُن سے مدّعا دل کا
غضب کیا جو محبت کو آشکار کیا
ہجو مے اور مرے آگے واہ رے لطف بیاں
حضرتِ واعظ اتر آئیں ذرا ممبر سے آپ

(تذکرۂ بہارستان ناز ص:۴۳،۴۴)

مولفِ تذکرہ مشاہیر نسوان کا بیان ہے۔

''منی بائی عرف منجھلی خوش باش کلکتہ ۱۲۸۶ھ کے پس وپیش میں عصمت اللہ انسخ سے اصلاح لیتی تھی موسیقی میں کامل اور علوم مروجہ سے واقف تھی''۔

پھر تصور کاکل جاناں کو مجھ کو آ گیا
سینۂ محزوں یہ پھر وہ سانپ لہرانے لگے
مزا یہی ہے کہ طرفین میں ہو بے چینی
مرے تڑپنے نے ان کو بھی بے قرار کیا

(تذکرۂ مشاہیر نسواں ص:۲۱۹)

مولفِ تذکرۃ النساء میں لکھتے ہیں۔

''منی بائی باشندہ کلکتہ شاگرد مولانا ناسخ مگر بہار میں اس کو صاحبِ دیوان اور شوکت کا شاگرد قرار دیا ہے۔

ایک دم بھی کسی کروٹ نہیں ملتا آرام
ہائے بچپن ہیں ہم درد جگر سے کیا کیا

(تذکرۃ النساء نادری ص:۱۶۷)

مولفِ تذکرۂ ماہ درخشاں رقمطراز ہیں:

''منی جان طوائف ساکن کلکتہ:

تلخی ہجر بتاں زہر سے بد تر ہی سہی
تم وہاں غیر سے تھے شیر و شکر وصل کی رات
اے حجاب ان کو غرور اور ہمیں بات کا پاس
عیش و آرام اِدھر تھا نہ اُدھر وصل کی رات

(تذکرہ ماہ درخشاں ص:۱۸)

مولفِ تذکرۂ نشاط افزا کا بیان ہے۔

''منی بائی کلکتہ کی مشہور طوائف تھی''۔

حالِ حجاب قابلِ شرح و بیاں نہیں
آنسو نہ ٹپکیں سن کے یہ وہ داستاں نہیں
دلمیں جگر میں سینہ میں پہلو میں آنکھ میں
اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں

پوچھو نہ حالِ زار مراتم سے کیا کہوں
گم کردہ راہِ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
وہ اور میرے گھر چلے آجائیں خود بخود
سر پر مرے حجاب مگر آسماں نہیں

(تذکرۂ نشاط افزا ص:۳۴، ۳۵)

یہ پانچ اقتباسات قدیم تذکروں کے ہیں جدید تذکرہ سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے مگر ان جدید تذکروں کے ماخذ یہی قدیم تذکرے ہیں اس لیے ان کے اقتباسات نہیں دیئے گئے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ حجاب شاعرہ تھی اور ابتداً شوکت علی اور پھر اسخ اور آخر میں مشہور استاد ناسخ سے مشورہ کرتی تھی اور پھر یہ معلوم کر کے آپ کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہوگا کہ حجاب نہ صرف شاعرہ تھی بلکہ استادی کا مرتبہ بھی رکھتی تھی چنانچہ اس کی چھوٹی بہن نقاب اسی سے مشورہ سخن کرتی تھی تذکرۂ نساء نادری نے لکھا ہے:

''حمیدن بائی ساکنہ کلکتہ جس نے رامپور اور ڈھاکہ وغیرہ کی سیر کی ہے مسماۃ حجاب کی شاگرد ہے''۔ ص:۱۷۶

تذکرۂ بہارستانِ ناز نے ذرا تفصیل سے لکھا ہے چونکہ آئندہ اوراق میں آپ کو نقاب کا نام کئی جگہ نظر آئے گا اس لیے ہم بہارستانِ ناز سے اس کے حالات نقل کئے دیتے ہیں تا کہ آپ واقف ہو سکیں۔

''حمیدن بائی نام کلکتہ خاص اس کی پیدائش کا مقام، رامپور سے ڈھاکہ تک کی یہ شاعرہ خوب سیر کی ہوئی ہے۔ طرز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح دار کو دل بھی دی ہے حالانکہ مالدار رہے

مگر طبیعت میں انکسار ہے۔ چوٹی ناگن سے زلف بلا ہے خوبصورت گلا ہے اس کے ناچ کے ٹھاٹھ نامی کتھکوں کو انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ بتانے کے ڈھنگ عاشقوں کو ملک عدم کا سیدھا رستہ بتاتے ہیں۔ بھاؤ میں لبھاؤ ہے بگڑنے میں بناؤ ہے۔ سولہ برس کا سن جوانی کے ارمان نکلنے کے دن شاعری سے رغبت عروض میں ضروری مداخلت یہ رشک ماہ شاگرد بی حجاب ہے کیوں نہ ہو یہ شاعرہ تو اپنی ہم عصر شاعروں میں انتخاب ہے اسی حجاب اپنی ہمشیرہ کلاں سے مشق سخن کرتی ہے''۔

میرے بجائے اس نے عدو کو بٹھالیا
یہ داغِ رشک مجھ سے اٹھایا نہ جائیگا
وہ اور وصل غیر یہ امرِ محال ہے
تسکین دے رہا ہے مجھے یار کا حجاب
فلک کے عدو کے دلِ غمزدہ کے
کہیں کیا کہ کس کے ستائے ہوئے ہیں
دور سب سے بزم جاناں میں میں بیٹھا رہ گیا
یہ نہ بولا ہائے کوئی ایک پیمانہ اسے
ذرا ہم کو سونے دے اے صبح محشر
شب ہجر کے ہم جگائے ہوئے ہیں
نہ تھے گھر میں غیروں کے یہ میں نے مانا
مگر کچھ تو ہے جو لجائے ہوئے ہیں

تذکرہ بہارستان ناز ص: ۹۱،۹۰

اب آپ نے حجاب اور نقاب دونوں کی پہچان لیا؟ قصے کے تسلسل کی خاطر ہم ایک بار پھر لکھ دینا چاہتے ہیں کہ رامپور کے بے نظیر کے میلے میں مارچ ۱۸۸۱ء میں حجاب رامپور آئی اور داغ اُس پر لٹو ہو گئے اور چند روز یکجائی بھی رہی اور پھر وہ رامپور سے کلکتہ چلی گئی۔ داغ نے بڑی کوشش سے مارچ ۱۸۸۲ء کے میلے میں پھر حجاب کو رامپور بلوایا اور دو مہینے تک یکجائی رہی اس کے بعد کلکتہ جا کر حجاب نے داغ کو بلوایا اور اوائل یا وسط ماہِ جون ۱۸۸۳ء میں داغ کلکتہ پہنچے اور پھر دونوں کی یکجائی رہی مگر پندرہ بیس روز سے زیادہ یکجائی نہ رہ سکی کیونکہ رخصت ختم ہوئی اور نواب صاحب نے بلوایا اور داغ ۳ جولائی کو کلکتہ سے روانہ ہو گئے اس طرح تین طویل ملاقاتیں داغ اور حجاب کی ہوئیں۔

داغ اپنی طبیعت کے لحاظ سے عیش پسند واقع ہوئے تھے اور تماش بینی ان کا مشغلہ تھا چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی معشوق ان کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے دل بہلایا کریں چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے حجاب کو پسند کیا تھا اور اس سے راہ و رسم بڑھائی تھی مگر اس عاشقی کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی تھی کیونکہ داغ ایک تماش بین کی طرح حجاب سے تعلقات رکھنا چاہتے تھے اور حجاب ایک ڈیرہ دار طوائف کی طرح یہ چاہتی تھی کہ داغ سچے عاشق ثابت ہوں اور وہی عشق کریں جو لیلیٰ مجنون، ہیر رانجھا، نل و من کا تھا۔ اس لیے دونوں میں شروع ہی سے اختلاف رہا، پہلی دفعہ تو جب حجاب کلکتہ چلی گئی تو داغ نے بہادر حسین خان انجم نیشاپوری کو ۳۰ راپریل ۱۸۸۱ء کو لکھا:

''وہ قافلہ لکھنؤ سے عظیم آباد پہنچا وہاں سے ایک قیامت نامہ میرے نام آیا جس کا مضمون قابل تحریر نہیں...... میں چاہتا ہوں

کہ جو حال آپ نے دیکھا وہ میری کیفیت کسی اور سے نہ کہنا خدا کے واسطے خاک میں نہ ملا دینا''۔ (انشاء داغ ص: ۴۸، ۴۹)

پھر ۲۳ جولائی ۱۸۸۱ء کو نواب انجم ہی کو لکھا ہے۔

''حجاب سے بے وجہ ترک نامہ و پیام ہے کمبخت اک بلائے بے درماں تھی کہ جس کے تصور سے اب تک نجات نہیں ہر چند اب بہت صبر آ گیا ہے لوگوں نے اس کو یقین ہے بہکایا، خدا ایسوں کو غارت کرے داغ کے مزاج میں بے وجہ عتاب کی تاب نہیں، آپ نے ناحق میری تصویر اُن کو بھیجی میں ان سے کمال ناراض ہوں آج کچھ طبیعت اچھی نہیں ورنہ گرما گرم جواب دیتا''۔

(انشائے داغ ص: ۴۹)

مارچ ۱۸۸۱ء کو پہلا آمنا سامنا ہوتا ہے اپریل کے وسط میں وداع ہو جاتے ہیں بیچ میں ایک ہی مہینے کا فصل پڑتا ہے کہ داغ جولائی میں حجاب سے بپھر جاتے ہیں اس طرح چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے خصوصاً مثنوی فریادِ داغ کی طباعت کے بعد یہ بات اور بڑھ جاتی ہے۔

رامپور میں نواب حیدر علی خاں جو کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے چھوٹے بھائی تھے حجاب کے آشنا تھے چنانچہ قیام رامپور کے زمانے میں حجاب چند روز تک حیدر علی خاں کے پاس رہی جس کی وجہ سے داغ بہت خفا ہوئے مگر کیا کر سکتے تھے البتہ ایک خط حجاب کو لکھا تھا جو نقل کیا جاتا ہے۔

''ستم گر و ستم پیشہ، شوقِ ملاقات کے بعد مدعا نگار ہوں کہ تم دو روز سے نواب صاحب کے یہاں تھیں۔ یہاں دل پر عجیب عالم گزر

گیا۔ میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہوگئیں۔اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں۔ جس سے واسطہ ہے اور جن سے وفاداری کا عہد کر چکی ہیں اپنے قول پر قائم ہیں۔ ایک طرف دولت ہے ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے۔ تمہارا دلدادہ اُن کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا مگر تمہاری الفت میں جان سے ضرور گزر سکتا ہے کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ تم کو یقین ہے؟ اور جب نہیں کر سکتے تو پھر کس لیے تم داغ سے پرستار کو محو کئے ہو؟ دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر قطعی ترکِ تعلق منظور و پسند نہیں تو پھر مجھے دید و شنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو   مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یہ رقعہ تمھیں جلانے کے لیے نہیں لکھا ہے نہ اس کا مطلب طعن و تشنیع ہے مدعا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میری کچھ دلداری فرمائیں۔ (منقول از مسودہ خطوط داغ مرتبہ رفیق مارہروی)

شاید اس کے جواب میں حجاب یہ باور کراتی ہے کہ نواب نے مجھے بلوایا تھا اور میں مجبوراً آ گئی ہوں اس پر پریشان ہو کر داغ نے اپنے کسی دوست کو جس کا نام معلوم نہ ہو سکا ایک خط لکھا ہے جو بڑا مزے دار ہے آپ بھی لطف اٹھایئے۔

محبّ داغ! اگر آپ مجھے یہ لکھیں کہ نوب صاحب کی بلائی ہوئی حجاب گئی تھیں یا خود انھوں نے ڈورے ڈالے تھے تو بڑی بندہ

نوازی ہوگی میرا دل و دماغ بہک چکا ہے دل میں زخموں کی حد نہیں رہی اور پھر یہ روز وشب کی نمک پاشی تلملایا جاتا ہوں، آپ طرفین کے حالات سے واقف ہیں خوب معلوم ہے آپ کو کہ نواب صاحب کے مقابلہ میں سوا اس کے کہ اپنے عشق کی آگ میں جل بھن کر کباب ہو جاؤں کچھ نہیں کر سکتا، آپ شاید نواب صاحب سے کہہ سکیں کہ داغ حجاب کے تیر نظر کے بے طرح گھائل ہے آپ کی دل بستگی کے لیے اور بھی سامان ہیں لیکن بے چارہ حجاب کو نہ پائے تو کہاں جائے اور اگر کہیں جائے تو وہ پھانس جو دل میں پیوست ہے کیسے دور ہو۔ جواب کے انتظار میں بے چین ہوں''۔

(منقول از مسودۂ خطوط داغ مرتبہ از رفیق مارہروی)

معلوم ہوتا ہے کہ نواب حیدر علی خاں کی محفل میں داغ کے کسی دوست نے حجاب کو نواب صاحب کی بغل میں دیکھا اور ان کے سامنے بے حجابیاں ہوئیں جس کی تاب وہ نہ لا سکے اور بگڑ کر حجاب کو ایک خط لکھ مارا، یہ خط انتہائی کرب و اذیت سے لکھا ہے اور غم وغصہ کا زندہ مظہر ہے۔

بے مہر و بے وفا! کل اس محفل سے بادل داغدار اور یاس وحرماں کا گھرا چرکا کھا کر آیا ہوں، اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ تماشا کب تک، معاملہ یکسو ہونا ضروری ہے۔ صبح وشام ہوتے ہوتے اتنا زمانہ تو گزر گیا آخر کوئی حد بھی ہے، کب تک مطاعن جگر دوز سنوں، کلیجے میں ناسور پڑ گئے ہیں اب تو اس کا علاج کرنا

ہی ہوگا۔ کہیئے آپ کے دل کی ہوس گھٹی یا بڑھی، وہ آدمی ضرور
بے حس ہے اور اس کے سینے میں بجائے دل کے فولاد کا ٹکڑا رکھا
ہوا ہے جو یہ منظر دیکھے اور چپ رہے، بے شک تم نے حرملہ اور
ابن سعد کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ تم بے شک خولی اور ابن نمیر
کی گود میں بیٹھیں اور تم یقیناً یزید کی معشوق بنیں۔ میرے جسم میں
خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے، تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ
یہ سب شکرے مل کر نوچا کھسوٹا کریں، آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے
کون جانے اس کا کیا انجام ہو۔ یہی لیل و نہار ہیں تو داغ کا
سلام قبول ہو، دل پر جبر کی سل رکھوں گا تمہارا نام نہ لوں گا۔ آخر
بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

(منقول از مسودۂ خطوط داغ مرتبہ از رفیق مارہروی)

حجاب نواب حیدر علی خاں کے پاس سے واپس آ گئی تو بھی داغ کے پاس نہ گئی بلکہ
اپنی بہن سے ایک چٹھی لکھوا دی کہ طبیعت خراب ہوگئی ہے اس لیے نہ آسکیں اس
پر داغ نے نقاب کو لکھا ہے۔

''بی حمیدن بائی! تم نے یہ خوب سنائی کہ وہ آنے والی تھیں مگر
ناگہاں طبیعت خراب ہوگئی جان کے لالے پڑ گئے وہ تو زندگی تھی
کہ دو تین کہڑی دورے سے تکلیف اٹھا کر وہ ٹھیک ہوگئیں کل
خان صاحب بھی آئے تھے اُن سے دیر تک ذکر رہا۔ وہ دیر تک
وہاں بیٹھ کر آئے تھے انھوں نے تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی
جس سے ناگہانی علالت کا پتہ چلتا یہ کیا بات ہے آخر ایسا کیوں

مجھے لکھا گیا اس سے ان کا کیا مقصد تھا کیا میری آزمائش منظور تھی؟ سوچتی تو ہوں گی کہ داغ کتنا سنگ دل ہے تکلیف اور بیماری کا حال سن کر بھی بھاگا ہوا نہیں آیا اور اگر کسی وجہ سے آنا ممکن نہ تھا تو خیر خبر بھی نہ لی۔

اب اس پرچے سے اصل بات معلوم ہوگئی تو ہوش اڑیں گے بڑا لطف آئے گا اور پتہ چلے گا کہ ہم اتنے بے خبر نہیں رہتے جتنا کہ وہ خیال کئے ہوئے ہیں اس میرے پرچے کو دیکھ کر کیا رنگ ہوا ہوگا سب حال مجھے لکھ بھیجا"۔ (منقول از مسودۂ خطوط داغ)

اس طرح حجاب کے رامپور میں رہنے تک جھک جھک ہوتی ہی رہی اور جب وہ کلکتہ واپس ہوگئی تو جاتے وقت دونوں ایک دوسرے سے صاف تھے چنانچہ حجاب کے رامپور سے جانے کے فوراً بعد ہی داغ نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

"دل دار و دل نواز! کیا غضب ہے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی تمہاری نگاہیں پھر گئیں۔ وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کردئے۔ خط روانہ کیا تھا وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال ہوگیا، میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں، کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا، کیا تلملانا میں نہیں جانتا، اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا، تم سے وعدہ لیا تھا اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا آج دس دن

ہو گئے خیر ہے نہ خبر اور کچھ اگر نہ لکھتیں تو خریت سے ہی اطلاع دے دیتیں، یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے، کوئی بات اچھی نہیں لگتی، جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے''۔ (منقول از مسودۂ خطوط داغ)

داغ کی کلکتہ سے واپسی جولائی ۱۸۸۲ء کے بعد سے اگست ۱۸۸۵ء تک کے زمانہ کا کوئی ریکارڈ ہمیں مل نہ سکا البتہ محبّ مکرم مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری نے داغ کے (۳۰) غیر مطبوعہ خطوط عنایت فرمائے ہیں جو بڑے اہم اور کارآمد ہیں یہ وہ مسودات ہیں جنھیں داغ کے عزیز شاگرد اور حاضر باش دوست فیروز شاہ خان فیروز رامپوری نے جمع کیا تھا جو رامپور میں باہر کے اخبارات کے صدر رپورٹر اور داغ کے خاص شاگردوں میں سے تھے چونکہ اس عاشقی کے دوران کے زمانہ میں فیروز سے داغ کے خاصے مراسم تھے اور وہ اس واردات سے واقف بھی تھے اس لیے فریادِ داغ کی تاریخ بھی انھوں نے کہی ہے جو فریاد کی اشاعت [1] اولین میں طبع ہوئی ہے۔

ان خطوط میں پہلا مسودۂ خط ۱۲/ اگست ۱۸۸۵ء کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کے کسی انگریزی اخبار میں کسی منی بائی کے انتقال کی اطلاع چھپی تھی جو بخشی عبدالرحیم خاں نے داغ کو سنائی۔

''منی جان! تمھیں اللہ کی امان! اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں بخشی عبدالرحیم خاں صاحب میرے پاس اخبار انگریزی لائے بہت پریشان آئے میں نے کہاں بخشی خیر تو ہے؟ تو کہا منی

---

[1] اشاعتِ دوم (ملاحظہ ہو مطالعۂ داغ تمکین کاظمی ص: ۲۳۲

بائی کا کچھ حال ہے! یہ سنتے ہی ہوش وحواس جاتے رہے انھوں نے ترجمہ کیا مجھے یقین ہوا کوئی اور منی ہوگی، آب ودانہ حرام ہوگیا دل کو سمجھا تا ہوں نہیں مانتا ترجمے کو دیکھ کر کیفیت مفصل جلد لکھو زیادہ خیریت''۔

۵ ستمبر ۱۸۸۵ء کو حمیدن بائی کو بڑے مزے کا خط لکھا ہے۔

''نونہالِ چمن حسن و جمال حمیدن بائی صاحبہ وفا خصال سلمہار بہا! آج تمہارا خط آیا مگر مدت کے بعد اس سے پہلے دو خط بائی صاحبہ کے آئے میرا حال قابل افسوس ہے۔ بائی صاحبہ کا ایک خط جو قابل ملاحظہ بندگانِ حضور تھا وہ پیش ہوا اور نہایت باعث انبساط وسرور ہوا میں تو مہینے بھر سے دربار نہیں گیا مصاحبوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نہایت تعریف فرمائی اور واقعی جوایسی خیر خواہانہ بات لکھے گا اس کی تعریف کیوں نہ ہوگی مجھ کو تم صاحبوں سے نہایت شکایت وملال ہے اگر تم خط نہ بھیجتیں تو میں ہرگز یہ سلسلہ جاری نہ رکھتا ذرا غور کرو انصاف سے دیکھو، کیا کیا تدبیر وسعی تمہاری عزت ونام آوری میں کی گئی کاش اس قدر میں دیدار خدا کا مشتاق ہوتا ایسی حالت ردی میں جس سے محبت ہوتی ہے وہ بہت یاد آتا ہے میں نے پہلے سنا تھا قرآن اٹھ گئے ہیں عہد و پیمان ہو گئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے! اب یقین ہوا، مجھے بھی منظور نہیں کہ میرے ملنے سے بائی جی کے ایمان میں فرق آئے۔

ہو ملاقات تو صفائی ہے اور صفائی نہیں تو پھر کیا ہے

بائی جی کو لگا لینا آتا ہے لگا رکھنا نہیں آتا اس سے یہ دشوار ہے لعنت ہے اس ملاقات اور اس دشمنی پر کہ جو برے وقتوں میں کسی کے کام نہ آئے چوتھا دن ہے کہ ایک تار بھی بھیج چکا ہوں پہنچا تو ضرور ہوگا۔

جدائی تری کس کو منظور ہے   زمیں سخت آسماں دور ہے

یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا بائی جی کے ''دماغ کا مزاج'' میری طرف سے ضرور پوچھ لیناان کے زکام سے اور نا کام ہوا، تمہاری علالت بھی ابھی چلی ہی جاتی ہے، خدا خیر کرے، دو وجہ سے میرا کلکتے آنا ہوتا ایک بائی جی سے ملاقات دوسرے حکیم دادار بخش سے معالجہ، بائی جی سے مایوس ابدی ہوا، حکیم جی کا حال ردی سنا نہایت صدمہ اٹھایا ....فصد اور جونکوں کے بعد پرسوں املتاس کا مسہل ہوا کچڑی ہضم نہ ہوئے جلاب کے دستوں کے علاوہ تخمہ کے دست شروع ہوئے آج اتنی طاقت نہیں کہ دوسرا مسہل ہوتا کل یا پرسوں ہوگا.....

حمیدن بائی کو یہ خط لکھنے سے ایک دن پہلے ہم ستمبر کو مہاراج یوراج بیر بڑھا کر ہرکشن بہادر بیدار کو ایک خط لکھا ہے۔

''مہاراجہ والا شان دام الطافکم !تسلیم ہماری قبول ہو گرامی نامہ آیا، آنکھوں سے لگایا خط جو کھول کر دیکھا تو نوٹ پایا نہ ہنڈوی کلدار علیہ السلام عجیب چیز ہیں بالفعل داغ کلکتے جانے والا ہے ایک ہزار تو ادھر سر کائیے دنیا میں جو کوئی رئیس ہوتا ہے بے

اختیاری میں بھی لوازمات ریاست اور مستحقانِ ریاست کا خیال رکھتا ہے یہ ریاست ہی نئی دیکھی میرا باپ بھی رئیس تھا اور بھی ریاستیں دیکھیں بادشاہت بھی دیکھی تعلق داروں کو بھی دیکھا یہ بات کہیں نہیں دیکھی اور نہ یہ استادی شاگردی دیکھی......

آپ ہیں راجہ حضرتِ بیدار بھیجیے جلد داغ کو کلدار
آ گے توفیق!

اے میرے راجہ بہادر! مجھ کو کیا معلوم کہ کانِ پنجاب جان پنجاب کون ہے؟ میری عاشق مزاجی کا شاہد میرا کلام ہے جس سامنے معشوق ہوتا ہے تو سوسرور حاصل ہوتے ہیں مجھ کو شراب پینے کی ضرورت نہیں تمہارا استاد بوڑھا ہے۔ مگر ہزار جوانوں سے بہتر ہے کبھی دل میں آتا ہے۔ اپنا عشق آپ ہو جاؤں، راجہ صاحب! ہمارے عاشق تم ہو جاؤ خدا کے لیے ہو جاؤ بھگوان کے لیے ہو جاؤ! منی بائی حجاب تخلص جو صاحبِ مثنوی فریاد داغ ہیں ہر چند بلاتا ہوں نہیں آتیں وہ مجھ کو بلاتی ہیں مجھے حضور پر نور جانے نہیں دیتے اور بالفعل میرے دم ہی پر بنی ہوئی ہے، پشت پر ایک دانہ نکلا ہے جس کی سوزش الحفیظ فصد ہوئی جونکیں لگیں مسہل ہوئے آپ بھی دعا کیجیے اور میری علالت اخباراتِ پنجاب میں چھپوا دیجیے کہ سب احباب کو خبر ہو جائے کلکتے کے اخباروں میں چھپ گئی راجہ صاحب! آپ اپنی طرف سے ایک خط منی بائی حجاب کو ضرور بھیجیے بدیں مضمون کہ ہماری نظر سے آپ کی مثنوی گزری اگر

یہ حال سچ ہے تو نہایت لائق آدمی ہو بلکہ منتخب روزگار ہو مگر ایک بات سے تعجب ہے کہ باوصف اس علالتِ شدید کے جس کا صدمہ تمام ہندوستان کو ہے اور خلق خدا دست بدعا ہے آپ رامپور نہ جائیں! اگر ہزار روپیہ کی نوکر ہوتیں تو ایسے وقت میں نوکری چھوڑ دیتیں وضع داری سے نہایت خلاف ہے جب تم سا شخص باوصف اس خلق کے ایسی کج ادائی کرے تو کیا کسی سے امید ہو اور اگر مصارف کی ضرورت ہو تو میں صرفِ مناسب کا کفیل و وکیل ہوں، مہاراجہ صاحب! یہ نہ جانئے کہ استاد مجھے پھنساتے ہیں وہ ایسے آدمی نہیں کہ میرے باب میں اور کسی سے تکلیف ہو، یہ الفاظ آپ کے مرتبہ کے موافق لکھوائے جاتے ہیں۔ آئندہ آپ جانیں آپ کے خط کے جواب میں دیر ہو تو آپ ان سے تار جوابی حاصل کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا میرا مدعا یہ ہے کہ ہر طرف سے اس پر لے دے کی جائے مگر پھر یہ کہتا ہوں کلد ارضرورلوں گا جو آپ کی توفیق ہو......''۔

یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء کو منی بائی حجاب کو خط لکھا ہے۔

''میزبانِ داغ مہمان سلامت رہو! پہلے خط روانہ کر چکا ہوں ایک ایک دن ایک ایک مہینہ ہو رہا ہے، اگلی بار جو میں گیا تھا کھانا پکانے والے کی طرف سے نہایت تکلیف اٹھائی تھی میرے فرزند مرحوم کی انا جو تمہاری خدمت میں بھی حاضر ہوئی تھی وہ آج مستدعی ہوئی کہ اپنی روانگی سے پیشتر مجھے وہاں پر بھیجدو میں سب

کام کرلوں گی، بائی جی کی خدمت میں رہوگی کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہے اگر تم مناسب جانو تو میں اس کو پہلے روانہ کردوں، بغیر تمہارے وہ نہ رہے گی اور مردانے مکان میں میں نہ رکھوں گا اس میں جو مناسب جانو وہ مجھے ہدایت کرو میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ جس مکان میں پہلے ٹھہرا تھا وہی میرے ہاتھ لگے، میاں عبد الرزاق کو بھی اس باب میں لکھا ہے دیکھئے کیا جواب آتا ہے''۔

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء کو حجاب کے نام ایک خط لکھا ہے۔

''مہربان داغ قدرداں داغ سلامت رہو! لو مبارک ہو! واہ میں بھی کیا خود غرض آدمی ہوں اپنا مطلب نکلے اور دوسروں کو مبارکبادی! جی تو چاہتا تھا نہ لکھوں کہ سناٹا گزر جائے گا خدا جانے کون کون اس رشک سے مر جائے گا کیا کروں بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی الحمد للہ کہ اب برآئی بگاڑ کر جانا تمہارے پاس دشوار نہ تھا مگر نہ تو میری آدمیت نہ تمہاری اجازت حضور پُر نور دام اقبالہم نے جان لیا کہ اس کی جان مفت میں جاتی رہے گی، پرسوں بطیب خاطر فرمایا کہ تم کلکتہ چلے جاؤ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے وہاں جا کر دو چار ہفتے میں آسکتے ہو عدم کو جاؤ گے تو میں کہاں پاؤں گا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے بسر و چشم منظور کیا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ دو دن میں اُڑ کر چلا جاؤں مگر طاقت سفر ابھی کہاں! گرمی وہ پڑتی ہے کہ الاماں، گل نیلوفر، دھنیا، تخم پالک،

خیارین، شربت آلو، یہ پینے کو ملتا ہے، حرارت بڑھی ہوئی ہے، مانع سفر ایک او امر ہوا کہ محرم شریف میں دسہرہ واقع ہوا، ہندو مسلمان میں جھگڑا پھیلا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، اس کا خیال اس کا انتظام ضرور ملحوظ رہے لہٰذا حسب تجویز سرکار عالی وقار چودھویں محرم شریف کو یوم روانگی مقرر ہوا، اللہ راس لائے اور تم سے ملائے، یہ بھی ارشاد ہو کہ بے اطلاع آؤں یا با اطلاع، پہلے دردولت پر سلام کو حاضر ہوں یا اور کہیں ٹھہروں؟............

بہت دل شکستہ ارمان بھرا بے سروپا آتا ہوں میری لاج تمہارے ہاتھ ہے یا خدا کے ہاتھ، تمہارے گھٹنے کے درد نے اور بے چین کردیا ٹھہر بھی ہیں سکتا............

میں نہیں چاہتا کہ میرا ابھی جانا وہاں ظاہر ہو اس خط کو پڑھ کر چاک کر ڈالنا تمہاری وجہ سے وہاں میرے دشمن بہت ہیں خدا سے تائید اور تمہارے التفات سے چاہتا ہوں بہتر تو یہی تھا کہ میں مصارفِ زادِراہ بھجوا دیتا اور تم قدم رنجہ فرماتیں مگر کلکتہ کی قطب بن کر بیٹھ گئی ہو میں کیا کروں، میرا ارادہ جریدہ آنے کا ہے۔"

ایک خط بلا تاریخ بھی ہے جو حجاب ہی کے نام ہے اس خط میں داغ نے شکایت کی ہے کہ مصنوعی دانت جو انھوں نے منگوائے تھے حجاب نے نہیں بھجوائے۔

"واللہ منی بائی! تمہاری کم التفاتی سے مجھے بہت رنج ہوا آئندہ تکلیف نہ کرنا میں نے تجویز کی ہے کہ میرٹھ میں انگریز کاریگر ہے اس کو بلاؤں تمہارا تو بہت انتظار کیا جواب دنداں شکن

پایا..... مثنوی تمہاری تھی تمہارے حال کی تھی تمہاری صفات کی تھی میں نے حالِ واقعی موزوں کر دیا ہے............ صاحبِ مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں مکرّر چھپ گئی، خدا جانے اس مثنوی کا اثر تم نے کیا دیکھا مجھ پر تو چاروں طرف سے بوچھار ہے اور اشتیاق ہے جو اس کلام کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ مرزا داغ سلامتی سے سولہ برس کے ہوں گے............

حافظ احمد علی خاں شوق صاحبِ گلدستہ ریاض سخن کے ہاں جو مصرع طرح ہوا ہے اس میں ایک مطلع میں نے بھی بکا ہے اس کی داد چاہتا ہوں۔

سب کچھ تو ہو چکا یہ فقط انتظار ہے
کہدیں بگڑ کے آپ تجھے اختیار ہے

۲ فروری ۱۸۸۶ء کو عبدالغفور نساخ کے نام ایک لمبا چوڑا خط لکھا ہے جس میں من جملہ اور باتوں کے ایک جملہ یہ بھی لکھا ہے:

''یقین ہے کہ حجاب سے آپ ضرور ملتے ہوں گے اور بموجب اپنے عہدے کے آپ نے ہمارا انصاف کیا ہوگا''۔

داغ بڑے ماہر تماشبین تھے اِدھر دیکھا اُدھر آنکھ ملائی آنکھ ملی کہ پہنچا پکڑا ادھر پہنچا پکڑا کہ پچھاڑا، بڑے مزے سے گھیر لیتے تھے چنانچہ قطب الدین اشک کو حجاب کی مزاج پرسی کے لیے کلکتہ بھجوایا تو وہ حجاب سے ملک کر آتے آتے ملکہ جان سے یہی ملتے ہوئے آئے اور ملکہ جان نے اپنی ایک مثنوی ان کے ذریعہ داغ کے پاس بھجوادی بس پھر کیا تھا داغ نے ۱۳/ مارچ ۱۸۸۶ء کو خط لکھ ہی دیا۔

''ملکۂ اقلیم سخنوری بنارس کی صنم کلکتہ کی پری دام جمالہا وکمالہا!
کیوں جی! خدا نے مجھ کو کیوں عاشق مزاج بنایا، اس بلا میں کیوں
پھنسایا پتھر کا دل لوہے کا کلیجہ کیوں نہ بنایا؟ جس میں کوئی اچھی ادا
دیکھی طبیعت لوٹ ہوگئی خصوصاً کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گو
بھی ہو تو مرزا داغ کی موت ہے فریادِ داغ کے مطالعہ سے کیفیت
معلوم ہوئی ہوگی۔

رحم آتا ہے اپنی حالت پر پڑیں پتھر بتوں کی چاہت پر

میر قطب الدین اشک کو منی بائی کی مزاج پرسی کے لیے کلکتے بھیجا
تھا اب جو وہ وہاں سے واپس ہوئے تو تمہارا سند یسا لائے مثنوی
جو عنایت ہوئی اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں، بغیر ملاقات
کے اس کی پوری داد نہیں دے سکتا اس بحر میں مثنوی شاذ و نادر
دیکھی گئی بلا کی شوخی ہے آفت شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہے
زبان ہندوستانی قوم انگریزی یہ دمریزی تصنیف لا جواب ہے
میں حیران ہوں کہ تم نے مجھے کیونکر جانا اور جانا تو اس قدر جانا یہ
خدا جانے کہ اچھا یا برا جانا اس کو تمہارا ایمان جانے، ایک مدت
سے تمہاری شہرت سنتے سنتے کان بھر گئے تھے خصوصاً آغا مرزا
شاغل نے چوتھے آسمان پر بٹھا دیا تھا''۔

آہا! یہ تو کہیے میں نے سنا ہے کہ منی بائی سے بڑے ربط وضبط ہیں
خدا خیر کرے بارے میری برائی اور کوسنے میں تم شریک تو نہ ہوتی
ہوگی خیر یہ صبر خالی نہ جائے گا ہم بھی سہاگ بھاگ گاتے ہیں گو ہر

جان کو ہمارا اسلام کہہ دینا یقین ہے کہ یہ بھی لکھی پڑی ہوں گی ع

''ایں خانہ تمام آفتاب است!''

یہ ابتدا تھی دو ایک خط اور لکھنے کے بعد ۹ راگست ۱۸۸۶ کو بس ڈورے ڈال ہی دئے۔

''دلربا سخن آرا حور لقا پری ادا، دام جمالہا و کمالہا''

تمہارا پہلا خط جو ایک دفتر شکر و شکایت مجموعہ رشک و رقابت تھا میرے پاس پہنچا اس کا جواب مناسب میں نے تمہارے مکان پر بھیجا اور نہ پہنچا بڑے افسوس کی بات ہے۔ نہایت بدانتظامی اور کم توجہی گو ہر جان کی متصور ہے''۔

مسودہ کیسا قلم برداشتہ خط لکھتا ہوں آج تمہارا دوسرا خط آیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خط جن اڑا لے گئے، پریوں کے پاس جن ہوا کرتے ہیں، کیا عجب ایسا ہی ہوا ہو، مگر ایسی جگہ آدمی کی مٹی خراب ہے، خصوصاً مجھ سا بھولا بھالا انسان کیا کرے؟ اس خط کے عوض کاش مجھ کو ہی اڑا کر لے جاتے، پہلے خط کے جواب میں بہت کچھ لکھا تھا مگر اب یاد نہیں رہا تمہارے خط کے گوشے پر بنارس کے جلے ہوئے مردے کی تصویر تھی کہ جس سے میں ڈر گیا تھا اور میں نے تمہاری تصویر اور بھی چند تصویریں محمد وزیر سے بے قیمت طلب کی تھیں۔ انھوں نے اس روپ میں درشن دئے جیسا دو ویسا پاؤ تمہاری عنایت غائبانہ کا میں نہایت شکر گزار ہوں اس زمانے میں کون کسی کو یاد کرتا ہے؟ دل ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا ملکہ جان! تھوڑا سا حال اپنا لکھ کر تم کو اطلاع دینی ضروری جانتا ہوں، کان

رکھ کر سنو الحمد للہ کہ مجھ کو خدا نے عالی خاندان میں پیدا کیا، دلّی میرا وطن ہے جب وہ برباد ہوئی تو احتیاج روزگار ہوئی رامپور میں نوکر ہوں رطب و یابس اللہ تعالیٰ گزارتا ہے چالیس پچاس آدمیوں کا رزق خداوند کریم دیتا ہے۔ رئیس میرا قدر دان ہے اور ہم عمر و ہم وطن منفعت دنیا پر اگر نظر کرتا تو بہت کچھ پیدا کر لیتا ہندوستان میں کونسی جگہ ہے جہاں اس عاجز کی طلب نہ ہوئی مگر اپنا یہ حال ہے ؂

کرا دماغ کہ از کوئے یار برخیزد
نشستہ ایم کہ از تا غبار برخیزد

کاروبار ریاست اس قدر سپرد ہیں کہ جس سے مرنے کی بھی فرصت نہیں، حجاب سے جو دلگی ہوگئی تھی ایک داستان طول طویل ہے اکثر وہ حال تم کو مثنوی فریادِ داغ سے ظاہر ہوا ہوگا سر مو فرق نہیں ہے مختصر یہ کہ اس شخص کا میں نہایت ممنون ہوں اس رامپور میں تلوار کی دھار پر مجھ سے ملی اور اس ملاقات کو ایک آدمیت اور اطاعت کے ساتھ بے غرضانہ کلکتے تک بنارہا اس ملاقات کی شہرت تو کیا رسوائی تمام ہندوستان میں ہوئی مگر جدائی بھی ایسی ہوئی کہ ملاقات کی امید نہ رہی میں ایک ریاست کا نوکر اہلکار کلکتے میں ہمیشہ کیونکر رہ سکوں اتنی مقدرت کہاں سے لاؤں ترکِ روزگار کیونکر ہو سکے کہ یہ وسیلۂ آبرو اور حیلۂ معاش ہے۔ بائی جی کو یہ ضد بیہودہ ہوئی کہ تمام عمر رامپور کی صورت نہ دیکھوں ورنہ ممکن

تھا برس دن میں دو چار مہینے کو وہ ہمیشہ آکر مل جایا کرتیں اگر چہ ہم غریب آدمی ہیں مگر ایسا بھی نہ ہوتا کہ ان کی مہمانی نہ کر سکتے بارہا انھوں نے بلایا مگر میں نے جانا مناسب نہ جانا کہ مبادا کوئی صدمہ اٹھاؤں، میرا صدمہ اٹھانا فتنۂ محشر کا اٹھنا ہے نہ اِدھر کا رہوں نہ اُدھر کا رہوں بارہا میں نے ان کو ملنے کے لیے بلایا لکھتے لکھتے انگلیاں گھس گھس گئیں دفتر سیاہ ہو گئے مگر وہ نہ آئیں مجبوراً ایک زمانہ دراز کے بعد اپنے دل بہلانے کی صورتیں بہت سی نکال لیں اور وہ بھی آل احمد صاحب کی پابند ہوگئیں یاس کلی ہوئی"۔

میرے خمیر میں عشق ہے میں وفا کا پتلا ہوں جو مجھ سے ملا اور مل کر چھوٹا یاد کرتا رہا، اس صورت میں بھی ملاقات کا لطف ہے اب تک کوئی آدمی مجھ کو مہربان مزاج داں نہ ملا کہ حجاب کا داغ داغ کے دل سے مٹا دیتا بہت تلاش کی اور ہے اور رہے گی۔ تم کو ایک وضع دار سنا تھا کہ اس کا ثبوت نامہ ہائے دلنواز سے پایا گیا دنیا میں ایک سے ایک اچھا ہے نہ مرزا داغ پر موقوف نہ حجاب پر منحصر"۔

داغ اک آدمی ہے گرما گرم
خوش بہت ہونگے جب ملیں گے آپ

مجھ کو تمہارے ملنے کا شوق تم سے زیادہ پیدا ہوا کیونکہ ہنوز دل سے دل کو راہ ہے ہر چند کہ کلکتے کی آب و ہوا مجھ کو موافق ہے مگر وہاں جانا مجھ کو دشوار معلوم ہوتا ہے حیران ہوں کہ تم سے کیوں کر ملوں اور کہاں ملوں، ہاں اگر تم ملنا چاہو تو سو طرح مل سکتی ہو، میں بے

اختیار محض ہوں، منی بائی کو میری تمہاری خط کتابت کا حال کس طرح ظاہر ہوگیا کہ ان کا بہت بڑا عتاب نامہ میرے نام آیا ہے۔ یہاں کی دلگی سے ان کو چنداں بحث نہیں مگر کلکتہ کا رشک گوارا نہیں کرسکتیں یہ کیونکر ہو سکے کہ تم عنایت سے یاد کرو میں اس کا جواب نہ لکھوں ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے تو بھی سر رشتۂ تہذیب و آدمیت ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے گا ان کو ہم نے صاف لکھدیا میں وہ مظلوم ہوں کہ اگر میرے حال پر رحم کرو گی تو کھڑی بہشت میں جاؤ گی، اس خط کا پتہ ضرور لگانا، آئندہ اپنے خط پر اپنے دستخط بھی کیا کرنا کہ قابل اعتبار ہو اور میرے لائق جو کام ہو اس سے ہمیشہ یاد و شاد فرماتی رہو اپنے وزیر کو سلام کہہ دینا اور تصویروں کا پیام"۔

دیکھا آپ نے کس عمدگی سے داغ نے ملکہ جاں پر ڈورے ڈالے ہیں مگر ملکہ بھی ایک گرگِ باراں دیدہ تھی وہ ان کے جال میں نہ پھنسی یہ ملکہ مشہور طوائف گوہر جان[1] کی ماں اور بڑی زندہ دل شاعرہ تھی ایک دیوان اور ایک مثنوی چھپ چکی ہے کلکتہ کے صاحب لوگوں سے اس کے تعلقات تھے اس کی بیٹی بھی ایسی ہی انگریز بہادروں اور والیانِ ریاست کو لبھاتی رہی۔

داغ نے جو اپنے کلکتے کی روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہوسکا

---

[1] گوہر جان کے متعلق لسان العصر اکبرالہ آبادی کا یہ شعر ضرب المثل ہے۔

آج خوش بخت یہاں کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا — مرتب

کیونکہ اُدھر حجاب کسی مولوی کی جن کا نام آل احمد تھا پابند ہوگئی تھی اور اِدھر داغ بھی کچھ بددل ہوگئے نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ایک دوسرے سے انجان ہوگئے۔

۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب خلد آشیاں نے انتقال کیا اور دار السرور رامپور دار المحن بن گیا ایک ایک کر کے سب کھسک گئے اور داغ بھی ۲۰ دسمبر ۱۸۸۷ء کو ہمیشہ کے لیے رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اس کے بعد داغ اپنی ذاتی پریشانیوں میں ایسے پھنسے کہ حجاب کو بھول گئے پھر ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد آئے پھر دہلی گئے اور وہاں سے واپس آ کر مستقل طور پر حیدر آباد ہی میں رہ گئے۔ دسمبر ۱۸۹۹ء میں حضور نظام کے ساتھ داغ کو کلکتہ جانا پڑا اور انھوں نے کلکتہ پہنچ کر حجاب کا پتہ لگانا چاہا تو معلوم ہوا کہ حجاب نے کسی سے نکاح کر لیا اور بالکل اللہ والی ہوگئی ہے۔ اس لیے حجاب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ مگر داغ کے پرانے دوست احباب جو کلکتہ میں تھے اس سفر میں ملے اور ان سے پھر رسم دوستی تازہ ہوگئی چنانچہ قاضی عبدالحمید جو اپنے آپ کو محمڈن میرج رجسٹرار کہتے تھے بھی ملے جو حجاب کے حاشیہ نشینوں میں سے تھے انھوں نے داغ کا اشتیاق دیکھا تو حجاب کو مجبور کیا کہ موجودہ مولوی سے طلاق لے لے اور داغ سے عقد کر لے چنانچہ قاضی جی نے داغ سے مراسلت شروع کی اتفاق سے اس قسم کے دو خط ہمیں خطوطِ داغ کے مسودے سے ملے ہیں، ایک خط میں داغ قاضی کو لکھتے ہیں۔

''مصدر لطف و کرم جناب قاضی صاحب! السلام علیکم، آپ کا تحریر فرمانا کہ حجاب آنا چاہتی ہیں لیکن دوسرے مانع ہیں دل کو نہیں لگتی بھلا کوئی دل سے چاہے اور پھر بھی موانعات حائل ہوں سمجھ میں نہیں آتا انہیں شاید کچھ تردد اور تکلف ہے مجھے ذرا تفصیل سے

لکھئے کہ ان کا مدعا کیا ہے میری جو حالت ہے آپ پر ظاہر ہے
سب بتا چکا ہوں نہ میں وہ رہا اور نہ اب وہ پہلے جیسی رہی ایک
قدیم خلش ہے جو بے چین بنائے ہوئے ہے وہ چلی آئیں تو
وقت خوش گزرے گا ورنہ ویسے کچھ نہ کچھ دل چسپی کا سامان بہم
ہی رہتا ہے اُن سے کہہ دیجئے کہ گو میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن ان
کی لگن ویسی ہی تر و تازہ ہے میں انھیں امکان بھر ہر قیمت پر
حاصل کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے یقین ہو جائے کہ وہ خود بھی دل
سے میرے پاس آنا چاہتی ہیں ہر رکاوٹ دور ہو سکتی ہے بُعد
قرب ہو سکتا ہے اگر وہ چاہیں"۔ (بلا تاریخ)

اس کے بعد اور ایک خط لکھا ہے۔

"آپ نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ کوئی بات ہی تو ہے جو داغ اس عمر
میں ان کے لیے گھلا جاتا ہے ہر وقت انھیں من دھیان رہتا ہے
ایک خلش ہے کہ چلی جاتی ہے ایک پھانس ہے کہ دل میں کھٹکتی
رہتی ہے جس وقت گزرا ہوا زمانہ تصور میں جمتا ہے قیامت گزر
جاتی ہے قاضی صاحب! شاید آپ اس کیفیت کو محسوس نہ کریں جو
عاشق مزاج ازلی ہو جو حسن و جمال کو دیکھ کر جیتا ہو اس سے یہ نہ
پوچھئے کہ حجاب کے لیے کتنا اشتیاق اپنے دل میں رکھتا ہے میں
چشم براہ ہوں جلد یہ لکھ کر خوش کیجئے کہ وہ اب آنا ہی چاہتی ہیں۔
آخر یہ دیر کیا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ وہ بیک بینی دو گوش چلدیں
ہر حال اور ہر رنگ میں ان کا منتظر ہوں"۔ (بلا تاریخ)

اسی کے ساتھ داغ نے حجاب کو بھی ایک خط لکھا ہے۔

''بائی جی! غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو پاس ہوتیں تو سیر ہوتی تمہارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالہ بن جاتا کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو ہو جاتا کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے ہو جاتا ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا خدا کے واسطے یا جلد آ جاؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو شب و روز انتظار میں گزرتے ہیں وہاں کے لوگ کیونکر خوشی سے اجازت دیں گے تم ہی چاہو گی تو روانگی ہو سکے گی میں تمہارے لیے بلبلا رہا ہوں یہ خوفناک کالی کالی راتیں اور تنہائی، کیا کہوں کیوں کر تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں، یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں میرے دونوں خطوں کے جواب آنا ضرور ہیں''۔ (بلا تاریخ)

افتخار عالم مارہروی نے چند سال حیدر آباد میں داغ کے پاس رہ کر ان کا روزنامچہ لکھا ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کے روزنامچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ آج مرزا صاحب نے مجھ سے متعدد خطوط لکھوائے سات آٹھ خط لکھوانے کے بعد بولے ایک خط اور لکھنا ہے لیکن میں خود لکھوں گا پھر کچھ سوچ کر بولے کہ اچھا تم ہی لکھو۔

''دشمن جانی سلام شوق

عین انتظار میں تمہارا محبت نامہ دستیاب ہوا، کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا چوما اور چھاتی پر دھر رہا تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور

اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کر لو گے جب ہی تمہارے پاس آؤں گی خوب تم کو بھول جاؤں ۔

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
نادان کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آ جاؤ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے جواب میں لکھو کہ کب آ رہی ہو۔

ابھی حجاب سے عشق لڑایا جا رہا تھا اور عاشقی جتائی جا رہی تھی کہ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۱ء کو نوح ناروی آئے اور انھوں نے الہ آباد کی ایک طوائف کی تصویر بطور نذر پیش کی بس تصویر دیکھتے ہی داغ لٹو ہو گئے اس کے متعلق افتخار عالم اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں۔

''۱۵ دسمبر ۱۹۰۱ء آج مرزا صاحب کے ایک شاگرد الہ آباد سے تشریف لائے وہاں کی ایک طوائف نے اپنی تصویر بھیجی ہے اور تازہ غزلوں کی فرمایش کی ہے مرزا صاحب نے اس تحفہ کے جواب میں مجھ سے خط لکھوایا''۔

''حور کی صورت، نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو''!

کل محمد نوح صاحب تشریف لائے آج بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمہارے تصویر نہیں بلکہ تیر نام پوچھا تو سن کر خواہ مخواہ ایمان لانا پڑا (نبی جان بتقدیم نون) بار خدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے سیرت کی تعریف سنی تو

صورت سے بڑھ کر خوش آواز خوش مزاج پھر اس پر لکھی پڑھی،
زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے بجا ہے"

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ
اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

کیوں جی! تم سے کیوں کر ہیں تم کو کیوں کر دیکھیں کیوں کر سنیں!
اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں؟ جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال
کرو اس کا کیا حال ہوگا، تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی آؤ
ہائے مجبوری وائے مہجوری.........

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ سے شریر
سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا حال
کھچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

(انشائے داغ ص:٦٦،٦٧)

۲۵ دسمبر ۱۹۰۱ء کا روزنامچہ ہے۔

"منی بائی حجاب جن پر مرزا صاحب کلکتہ میں عاشق ہوئے تھے
اور جن کے مرزا صاحب طلبگار تھے حیدر آباد آنے کو آمادہ ہوگئیں
چند برس سے حجاب نے کوئی شخص......صاحب نے نکاح کر لیا تھا
خدا خدا کر کے ان سے طلاق لی مرزا صاحب کو خط لکھا سن کر خوش
ہوگئے آج بعد مغرب حسب معمول ایک طرف صدر میں مرزا
صاحب بیٹھے تھے چند اور احباب بھی تشریف فرما تھے فرمانے لگے

کیوں جی منی بائی کو عدت میں بیٹھنا پڑے گا؟ لوگوں نے جواب دیا کیوں نہیں؟ فرمانے لگے دس برس میں بھڑوے سے کچھ نہ ہوا تو کیا عین طلاق کے زمانے میں کچھ ہو سکا ہو گا؟ بھائی مجھ سے تو یہ نہ ہو گا کہ میں ان کو عدت میں بٹھاؤں ویسے وہ میرے نزدیک ۲۲ برس سے عدت میں بیٹھی ہوئی ہیں''۔

یہاں داغ نے ۲۲ برس کی مدت کا اندازہ بھی غلط بتایا ہے حجاب سے ان کی عاشقی مارچ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوتی ہے اس طرح ۱۹۰۱ء تک ۲۰ سال نو ماہ ہوتے ہیں یہ اندازہ بھی عظیم آباد کے ایک ہفتے کے اندازے کی طرح غلط ہوا ہے۔

۸ جنوری ۱۹۰۲ء کے روزنامچے کی عبارت یہ ہے۔

آج منی بائی حجاب کا ایک خط آیا اُسے پڑھ کر مرزا صاحب بولے کہ حجاب خط میں یہ عہد فرما رہی ہیں کہ جب تک نکاح نہیں کرلوں گی تمہارے سامنے نہ آوں گی میں نے یہ تمام جھگڑے اس لیے نہیں کئے ہیں کہ شرعی باتوں سے قطع نظر کرلوں تم اس بھروسہ میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آجاؤں میرے لیے علیحدہ مکان لینا اسی میں اتروں گی اور جب تک قاضی نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت تک تم میری صورت دیکھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ اِتنا کہ کر مرزا صاحب بولے کہ بہت اچھا ایسی دھجیاں اڑاتا ہوں کہ وہ بھی خوب یاد کریں بے تکلف حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر بولے دیکھو بھائی جب وہ تشریف لائیں تو مجھ کو ایسی جگہ چھپانا کہ وہ اگر ڈھونڈیں بھی تو نہ پائیں مگر حجاب ایک

چلتی ہوئی عورت ہے مجھے تو یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری عورت اس پردہ میں مجھ سے نکاح نہ پڑھوالے۔ انھوں نے جب مجھ سے یہ شرط کی ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوگا اس وقت تک سامنے نہیں آؤں گی تو میں کیسے جان سکتا ہوں کہ میری بیوی منی بائی ہی بنیں گی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ جب تک وہ یہاں حیدر آباد میں کھچوائی ہوئی فوٹو نہیں پیش کریں اس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا''۔

خدا خدا کر کے ۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو حجاب حیدر آباد پہنچیں ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو داغ نے حجاب کو کلکتہ میں اس کے گھر پر خدا حافظ کہا تھا اور اب ساڑھے انیس سال بعد حجاب کا خیر مقدم داغ نے اپنے گھر پر کیا بظاہر یہ ساڑھے انیس سالہ طویل عاشقی لوگوں کو عشق صادق کا یقین دلاتی ہے مگر یہ صرف وضع داری اور دلگی تھی اس جذبۂ تفریح کو محبت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا دونوں طرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ داغ اپنی دولت ثروت عزت وامارت کا نقش حجاب کے دل پر بٹھانا چاہتے تھے اور حجاب داغ کی دولت بٹورنا چاہتی تھی۔

۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء کو روزنامچے میں افتخار عالم لکھتے ہیں۔

''منی بائی آج چار روز ہوئے تشریف لے آئی ہیں ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ صوم وصلوۃ کی پابندی پانچ چھ برس سے ان کی گھٹی میں پڑ گئی ہے ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر مرزا صاحب فرمار ہے تھے

کہ دو چار برس میں ''ولیہ'' ہو جائیں گی۔ منی بائی حجاب جب
حیدر آباد وارد ہوئیں تو سب سے پہلی چیز جو تحفتہً ان کو پیش کی گئی
وہ ایک جانماز اور تسبیح تھی، جس روز سے منی بائی حجاب تشریف
لائی ہیں مرزا صاحب کی زبان پر ان کے زہد کا ذکر ہے۔ آج
فرما رہے تھے میرے گھر فرشتن آئی ہیں آسمان پر ایک شور مچا ہوا
ہے اللہ میاں کے پاس فرشتے فریاد لے کر گئے کہ آدمیوں میں
اے خدا! تو نے عبادت کی ایسی طاقت کب دی تھی پھر کیا وجہ ہے
کہ داغ کے گھر میں ایک ایسی عورت آئی ہوئی ہے جو ہم سے بھی
سبقت لے گئی مرزا صاحب اس ضمن میں یہ بھی بولے کہ میں نے
بی حجاب سے کہہ دیا ہے کہ نماز کے سوا جب تک تمہارے وظیفہ
وظائف نہیں چھوٹیں گے اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں
اور جب تک انسان نہیں بن سکیں اس وقت تک میرے کام کی
نہیں بہر حال تم یاد رکھو رفتہ رفتہ تمہارے سب وظیفے چھڑا دوں گا
اور تم کو خالی نماز پر اکتفار کرنا ہوگا''۔

۲۳ جنوری ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ دیکھئے۔

''ڈاکٹر احمد علی حیدر آباد میں ایک فوجی ڈاکٹر ہیں آج شام کو بہت
سے لوگ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں
ڈاکٹر صاحب تشریف لائے مرزا صاحب ان سے بولے کہ
حضرت: یہاں بی فرشتن آئی ہوئی ہیں، مرزا صاحب کی ایک ماما
کسی کام سے اسی وقت باہر آئی ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ یہ فرشتن

ہیں مرزا ہنس کر بولے نہیں یہ چڑیل ہے''۔

اس کے بعد منی بائی حجاب کا ذکر ہونے لگا مرزا صاحب نے بتایا کہ وہ دو تین سال کامل اجمیر رہی ہیں وہاں چلہ کشی بھی کی تھی کوئی مراد دل میں ہوگی، ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ نماز روزہ کیسا کہتی تھیں اب یہ حال ہے کہ ہر وقت نماز ہے اور ہر وقت تسبیح مصلیٰ پر بیٹھی ہیں کوئی نماز ایسی ہے جو نہ پڑھی جاتی ہو۔

ایک بے تکلف نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! کیا آپ ان سے شادی کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم ۲۲ برس کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا ہے میں تو راضی ہوں مگر وہ ابھی راضی نہیں ہیں بہر حال۔

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

اسی صحبت میں ایک بے تکلف نے کہا کہ حضرت آپ کی عمر ۷۲ برس ہو چکی اب آپ کس برتے پر عقد کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے نکاح سے کیا فائدہ؟ مرزا صاحب نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

جنابِ داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک
کہ وہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

مرزا صاحب نے فرمایا مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و ریشے میں سمائے ہوئے ہیں ایک منی بائی حجاب کا اور دوسرا خواجہ معین الدین چشتی کا''۔

سن لیا آپ نے عشق کے متعلق داغ کا نقطۂ نظر یعنی منی بائی اور خواجہ اجمیریؒ دونوں کا عشق اُن کے رگ و ریشے میں تھا۔ وہ بلندی یہ پستی اور یہ دونوں بھی فرضی اور تخیلی! حقیقت سے دونوں کو واسطہ نہیں تھا۔

۲۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو روز نامچہ میں افتخار عالم لکھتے ہیں۔

''جب سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب اپنے مردانے مکان میں کم بیٹھتے ہیں دو تین گھنٹے کے سوا سارا وقت حجاب کے پاس گزرتا ہے مرزا صاحب کی یہ ادا ان کے احباب کو بہت نا گوار ہے اسی وجہ سے ان کے مخلص دوستوں کی آمد و رفت کم ہوگئی ہے۔ آج بعد مغرب مرزا صاحب نے اپنے ایک دوست نواب حسن علی خاں کو جبکہ وہ دو روز سے تشریف نہیں لائے تھے مجھ سے یہ خط لکھوایا۔

''نواب بہادر! صاحب عالم بہادر (مرزا خورشید عالم برادر اخیافی مرزا داغ) کہتے ہیں کہ کل صبح پتنگوں کے پیچ ہیں بغیر نواب صاحب کی تشریف آوری کے کچھ نہیں ہوسکتا، مجھ کو خبر بھی نہ تھی کہ پیچ وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑے گا مردِ خدا یہ کیا بات ہے آپ نے ایک محنت کم کر کے کیوں ترک کر دی میں نے تو کوئی بات بغیر آپ کے مشورے کے نہیں کی مصلحت وقت نہیں چھوڑی جاتی، آپ کو حسب معمول روز آنا چاہیے اور ماحضر یہیں تناول فرمانا چاہیے اور اگر تنہا کھانا کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھائے مجھ کو بھی غم نہ کھلائے آیئے آیئے تشریف

لائیے''۔ (انشائے داغ ص:۶۹)

نواب حسن علی خان امیر بڑے وضعدار، غیور اور تیکھے بزرگ تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ مجھے اب روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے اس پر بگڑ کر داغ نے ایک اور خط نواب صاحب کو لکھا ہے جو ہمیں مسودۂ خطوط داغ سے ملا ہے۔

''نواب صاحب! آپ تو بیٹھے بٹھائے کلیجے میں نشتر چبھو دیتے ہیں یہ فقرہ کیوں کر دل دوز اور جگر افگار نہ ہو کہ اب مجھے روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے مجھ سے جو کچھ ہوا دانستہ نہیں ہوا حجاب جیسی ہزار ہوں تو تمہارے خلوص تمہاری محبت پر نثار تم سے کیا پردہ ہے اور تم سے کیا چھپا ہے تم اس پرچے کے جواب میں فوراً آؤ اور مجھ سے کچھ سنو''۔ (بلا تاریخ)

۲ فروری ۱۹۰۲ء کو قاضی عبدالحمید کو جنھوں نے داغ اور حجاب کو دوبارہ ملانے اور حجاب کو حیدرآباد بھجوانے کی کوشش کی تھی یہ خط لکھوایا ہے۔

''جناب قاضی صاحب مصدر عنایت و کرم سلمہ اللہ تعالیٰ!''

''سلام مسنون کے بعد مدعا نگار ہوں، آپ کا ایک عنایت نامہ پہنچا جس میں ایک دعائیہ شعر تھا بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہنچیں میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے میں رند خراباتی وہ زاہد مناجاتی دیکھئے کیا ہوا ابھی تک مجھ کو اس پردے میں معلوم نہیں ہوا کہ وہی ہیں یا کوئی اور''۔ (انشائے داغ: ۶۹، ۷۰)

۶ فروری ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ ملاحظہ ہو۔

''آج کی صحبت میں بی حجاب کا ذکر خوب رہا مرزا صاحب کے چند بے تکلف دوست جمع تھے جو مرزا صاحب کے تمام مشوروں میں شریک رہا کرتے تھے ایک صاحب نے ازراہ تمسخر دریافت کیا کہ کیوں صاحب! اب آپ کا سن یہ ہے کہ منہ میں بتیسی لگی ہوئی ہے، ڈاڑھی اور سر کے بال خضاب و مہندی سے سیاہ و سرخ کئے جاتے ہیں آخر کس برتے پر آپ حجاب سے نکاح کرنے پر مائل ہیں؟ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نکاح کی عام اصطلاح میں حجاب کو میں اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ رفیق بناؤں گا مجھے اپنی کبرسنی کا احساس ہے منہ میں قدرتی دانتوں کے بجائے بتیسی بھی مجھے محسوس ہوتی ہے وسیمہ اور مہندی بھی ہفتہ میں دو دفعہ لگتی ہے میری مسہری بھی ایک نوعروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے رنگین جالی کے پردے جن پر گوٹا اور ٹھپا ٹکا ہوا ہے، انگوری بیل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے تو پھر جب یہ سب باتیں مجھے روا ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ منی بائی حجاب میرے لیے جائز نہ کر دی جائے اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بیوی بیوی ہوتی ہے دوسری بیوی رفیق ہوتی ہے اور تیسری بیوی درحقیقت جان کا جنجال، مرزا صاحب کی اس گفتگو نے سب کو ساکت کر دیا''۔

۲۱ فروری ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ بڑا دلچسپ ہے ملاحظہ کیجئے۔

''مرزا صاحب درحقیقت بڑے شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں

بڑھاپے کا عالم بھی جوانی معلوم ہوتا ہے وہی مذاق وہی دلگی چھوٹی چھوٹی تین چار لڑکیوں کو پرورش کر رہے ہیں۔ صاحب جان اور امیری بڑی چنچل لڑکیاں ہیں جب ان کے پاس کوئی نہ ہوتا تو ان کو بلاتے ان سے مزے مزے کی باتیں کرتے اور وہ مرزا کا دل بہلایا کرتیں مرزا ان سے خوب کھل کر ہنسی مذاق کرتے کبھی کہا کرتے امیری میرا دل چاہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ شادی کرلوں، وہ جواب دیتی سرکار آپ کے سر کے بال سفید منہ میں دانت ندارد میں آپ سے شادی کر کے کیا کروں گی؟ آج شام کو جب میں پہنچا تو مرزا انہی رنگ رلیوں میں محو تھے میرے پہنچتے ہی صاحب جان اور امیری ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی گھر میں بھاگ گئیں، مرزا نے مجھے دیکھ کر برجستہ یہ شعر پڑھا۔

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

۲۷ فروری ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں افتخار عالم نے لکھا ہے۔

''مرزا صاحب ہفتہ میں دو تین مجرے ضرور سنا کرتے تھے مگر جب سے حجاب کلکتے سے آئی تھیں پہلا معاہدہ ان سے یہ ہوا تھا کہ کوئی طوائف یہاں نہ آنے پائے آج شام کو حجاب کے بھائی خدا بخش بیٹھے تھے میں بھی موجود تھا مرزا صاحب مخصوص خدا بخش کو چھیڑنے کے اکثر طوائفوں کا ذکر کیا کرتے تھے اور خصوصاً اختر جان سورت والی کا ذکر ضرور کرتے تھے وہ حجاب کے آنے سے

پیشتر کچھ دو برس تک مرزا صاحب کے پاس نوکر بھی رہی تھی، خدا
بخش کو یہ معلوم تھا کہ میری بہن سے مرزا صاحب کا معاہدہ ہوگیا
ہے لہٰذا کبھی کبھی خدا بخش بھی مرزا کو چھیڑا کرتے تھے وہ بولے
حضرت آج رحمت اللہ (مرزا کا گویا) کہتا تھا کہ ایک رنڈی نئی
آئی ہوئی ہے اور حسن سن کے ساتھ ساتھ گانا بھی لا جواب ہے
مرزا نے برجستہ جواب دیا کیا تمہاری بہن سے اچھی ہے؟ خدا
بخش جھینپ کر رہ گئے مرزا بولے آج اسے بلا کر ہم گانا سنیں گے
اور تم حجاب کی گالیاں سن لینا حساب برابر ہو جائیگا''۔

یہاں افتخار عالم کو مغالطہ ہوا ہے کہ اختر جان دو برس تک داغ کے پاس نوکر رہی تھی
حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں بھی جبکہ افتخار عالم اور حجاب حیدرآباد آئے ہیں اختر
جان داغ کے ہاں نوکر تھی مگر کچھ خفا ہو کر چلی گئی تھی جسے پھر داغ نے بلا لیا چنانچہ
حجاب کے آنے کے بعد اختر جب آنے جانے لگی تو داغ اور حجاب میں کشمکش
شروع ہوگئی اس کی تفصیل آپ آئندہ دیکھیں گے۔

۲۱/اپریل ۱۹۰۲ء کے روز نامچہ کو ملاحظہ کیجئے یہ ابتدا ہے حجاب سے
اختلاف پیدا ہونے کی!

''آج مرزا صاحب بہت ست نظر آتے تھے شام کو میر مردان علی
تشریف لائے وجہ افسردگی پوچھی مرزا نے فرمایا جب سے حجاب
آئی ہیں دوسری صحبت نہیں رہی مجرا سن کر دل بہلا لیا کرتے تھے
وہ بھی ختم کبھی کبھی کوئی طوائف سلام کے لیے آجاتی تھی وہ بھی ان
کو ناگوار ہے بتاؤ جس شخص کی گھٹی میں حسن و نغمہ پرستی ہو وہ کس

طرح اس قید و بند کو برداشت کر سکتا ہے بڑی دیر تک اس قسم کی
باتیں ہوتی رہیں بالآخر خود سوچ کر بولے کہ اچھا یارا ایک ترکیب
سمجھ میں آئی اور وہ یہ کہ آئندہ سے اپنے دوستوں کے یہاں
مجرے ہوا کریں روپیہ ہم صرف کریں اور نام ہو یاروں کا"۔

داغ دُھن کے پکے اور بڑے مستقل مزاج بھی تھے چنانچہ اس کے بعد ہی انھوں
نے حسن علی خاں امیر کو خط لکھا ہے۔

"نواب صاحب بہادر! بی حجاب کو اصرار ہے کہ اختر جان کو علیحدہ
کردوں اور اگر گانا سنوں تو کبھی کبھی کسی کو طلب کر کے دل بہلا لیا
کروں اختر جان کو ایک بری رقم پر ملازم نہ رکھا جائے اور اگر رکھا
جائے تو پابند نہ کیا جائے فرمائے اس ضد اور تراہٹ کا کوئی علاج
ہے؟ آج دو تین روز سمجھاتے ہو گئے لیکن ارادے اور زبان میں
ایسی پختہ ہیں کہ ذرا جنبش نہیں، جس روز سے یہ جھگڑا کھڑا کیا ہے
مجھے گانا سننے کو نہیں ملا دل کی عجیب حالت ہے کوئی عذر کر کے آپ
کے یہاں آتا ہوں اختر جان کو بلایا ہے وہ کیا عجب کہ مجھ سے
پہلے پہنچیں گانے کا بندوبست آپ کے یہاں ہوگا اور آپ سے
مشورہ بھی کرنا ہے"۔ (مسودہ خطوط داغ مرتبہ رفیق مارہروی) بلا تاریخ

۲۷/اپریل ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

"آج سہ پہر سے شام تک مرزا صاحب پتنگ بازی دیکھتے رہے
کبھی خود پتنگ اڑایا کرتے تھے مگر اب صرف اتنا رہ گیا کہ صحن
میں بیٹھے بیٹھے مرزا خورشید عالم کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھ لیا

کرتے ہیں مرزا کو قریب قریب تمام بازیوں کا کم وبیش شوق رہا ہے۔ بٹیر بازی، کبوتر بازی، گو خود نہیں کرتے لیکن دوسروں کے شغل میں شریک ضرور ہو جاتے ہیں موسیقی سے انھیں فطری لگاؤ ہے اور اس مذاق کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر واجد علی شاہ ہیں، ستار نواز، بین نواز، گویئے، ڈوم، دہاڑی ان سب کی پیشوار ندیاں ان کی صحبت کا لازمہ ہیں طبلہ خود بھی بجاتے ہیں۔ ستار میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں دو تین راگ راگنیاں خود بھی ایجاد کی ہیں شاہ ظفر کا ایجاد کیا ہوا ایک راگ بہت بجاتے ہیں، حیدر آباد کے قیام میں ایک رنڈی ہمیشہ ان کے پاس ملازم رہی الغرض یہ کہ مرزا صاحب کے شب و روز عیش میں گزرتے ہیں۔ منی بائی حجاب کے آنے کے بعد گو ان کا پروگرام بدل چکا لیکن ان کی تشریف آوری سے پہلے کونسا دن تھا جو ان رنگ رلیوں میں نہیں گزرتا تھا۔ مغرب کا وقت گزرا اور گانا سننے کو دل چاہنے لگا۔ ستار نواز نوکر ہے اس کو بلایا کہ گا بجا اسی وقت شہر کے طائفے بھی آجاتے ہیں دکنی طائفوں کا انھوں نے گانا نہیں سنا لیکن دو ایک طوائفین دکنی بھی آجایا کرتی تھیں، گھنٹوں ان سے ہنسی مذاق رہا کرتا تھا، سورت کی ایک طوائف اختر جان کوئی دو برس تک سو روپیہ ماہوار پر نوکر رہی دکن میں وہ حور سمجھی جاتی تھی۔ خوش اندام، خوش رو خوش وضع، خوبصورت، میانہ قد، مضطر ایسی کہ ایک جگہ اُسے قرار نہ تھا اس کی ادائیں مرزا کے دل

میں گھر کرگئی تھیں ورنہ...... کے لائق مرزا کا سن نہیں تھا۔ اختر
جان کچھ عرصہ کے بعد حیدرآباد سے سورت چلی گئی مرزا صاحب
اس کی فرقت میں شکستہ دل رہنے لگے لیکن حجاب کے آنے کے
بعد اب یہ دنیا سب خاموش و معطل ہے“۔

افتخار عالم نے جو اختر جان کے سورت چلی جانے کا حال لکھا ہے وہ بھی ان کی ناواقفیت ہے ان دنوں اختر داغ سے خفا ہوکر چلی گئی تھی اور ایک سشن جج کے گھر بیٹھ گئی بعد میں جب وہ سشن جج کے گھر سے نکل گئی تو پھر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے اُسے داغ کے پاس بھجوا دیا اور وہ مدتوں داغ کے پاس رہی، داغ کے بعد اختر حیدرآباد ہی میں رہی اُسے میں نے بھی بعض شادیوں میں دیکھا ہے خاصی بوڑھی ہوگئی تھی مگر پھر بھی اس میں ایک بات تھی ۱۹۱۲ء کے بعد اختر نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کا روزنامچہ بھی بہت دلچسپ ہے۔

”آج شام کو مرزا صاحب کے یہاں منی بائی حجاب کے فوٹو کھینچنے
کا اہتمام تھا بڑی زبردستیوں سے حجاب فوٹو کھینچوانے پر آمادہ ہوئی
تھیں مرزا صاحب بضد تھے کہ دونوں کا فوٹو ایک جگہ ہونا چاہیے
حجاب کو اس پر اعتراض تھا فوٹو گرافر نے اس جھگڑے کو اس طرح
ختم کیا کہ مرزا صاحب کو اشاروں اشاروں میں کچھ سمجھا دیا، مرزا
صاحب حجاب کی کرسی سے کچھ ہٹ کر پیچھے بیٹھ گئے فوکس لے لیا
گیا منی بائی کو بھی یقین رہا کہ صرف میرا فوٹو لیا جا رہا ہے لیکن فوٹو
گرافر نے باہر آکر مرزا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ عاشق و

معشوق کا یکجائی فوٹو پیش کرے گا، فوٹو گرافر کے رخصت ہونے کے بعد مرزا نے فی البدیہہ یہ رباعی ارشاد کی۔

تم تو فلک حسن پہ ہو ماہ منیر
سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
خالِ لب گلفام ہے شاہد اس کا
بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

یہ تصویر ناظر علی فوٹو گرافر نے لی تھی بچپن میں میں نے ناظر علی کے پاس دیکھی ہے اس کے علاوہ ایک اور تصو حجاب کی اکیلی ہی ہے جو میں نے دیکھی ہے یہ بسٹ تصویر تھی اس کا پلیٹ محمد یوسف فوٹو گرافر کے پاس بھی تھا اور اس کی کاپیاں امین الحسن بسمل مرحوم اور احمد حسن انصاری مرحوم کے پاس بھی تھیں۔ افتخار عالم نے جو اوپر کی رباعی کو فی البدیہہ لکھا ہے یہ بھی ان کی خوش فہمی ہے یہ اور اس کے ساتھ دوسری رباعیاں داغ نے اس وقت کہی تھیں جب حجاب نے اپنی تصویر کلکتہ سے رامپور کو بھجوائی تھی یہ تمام رباعیاں اسی تصویر کو دیکھ کر داغ نے کہی ہیں۔

اس شکل کا دنیا میں نہیں کوئی نظیر
صورت ہے طبیعت کے سوا شوخ و شریر
اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

ہر عیب سے خالی ہے تمہاری تصویر
دنیا سے نرالی ہے تمہاری تصویر
کس شکل مصوّر سے یہ پوری کھنچتی
دل کھینچنے والی ہے تمہاری تصویر

کیا خوب مصوّر نے اتاری تصویر
دیکھی نہ سنی ایسی تو پیاری تصویر
جب ہاتھ لگاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے
کہہ بیٹھے نہ کچھ منہ سے تمہاری تصویر

دل لے کے مکرتی ہے تمہاری تصویر
یہ بات تو کرتی ہے تمہاری تصویر
خاموش جو ہو جاتی ہے اس کے آگے
کیا داغ سے ڈرتی ہے تمہاری تصویر

چونکہ حجاب کے ہونٹ کے اوپر ایک تل یا مسّہ تھا جو سفید رنگ پر بہت کھلتا تھا اس لیے تصویر میں اُسے دیکھ کر داغ نے کہا تھا ۔

تم تو فلکِ حسن پر ہو ماہِ منیر
سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا
بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

اس تصویر کے واقعہ کے وقت چونکہ یہ پرانی رباعی حسب حال تھی اس لیے داغ نے سنادی ہوتو اور بات ہے، بہر حال یہ فی البدیہہ اس روز نہیں کہی گئی۔

حجاب بڑی کائیاں اور تجربہ کار عورت تھی اس نے حیدر آباد پہنچتے ہی سب سے پہلے رنڈیوں کی آمدورفت بند کرادی پھر اختر جان کو برطرف کرادیا اور داغ کو جوبیس گھنٹے اپنے پاس ہی بٹھانے لگی، اس طرح جب وہ حاوی ہونے لگی تو

اس نے نکاح کی ضد شروع کی تا کہ داغ پر پوری طرح مسلط ہو سکے۔

۳۰ مئی ۱۹۰۲ کے روز نامچہ میں افتخار عالم لکھتے ہیں۔

''آج شام کو مرزا صاحب فرمانے لگے کہ کچھ سنا نکاح کا تقاضا ہو رہا ہے۔ عدت کے دن پورے ہو چکے ہیں میں بھی طیار ہوں اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

برائے نام نکالے فلک مرے ارماں
جو ہے نکلنے کی حسرت کہاں نکلتی ہے

پھر فرمایا بڑھے ہو گئے منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں نکاح کا ماحصل اور جز و اعظم دونوں کے پاس ندارد۔

وقت آخر ہوا مگر اے داغ ہوسِ زندگی نہیں جاتی

افتخار عالم نے اپنا روز نامچہ ۱۵ جون ۱۹۰۲ء کی کیفیت لکھ کر ختم کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد انھوں نے کچھ نہیں لکھا یہ روز نامچہ جناب رفیق مارہروی کے پاس محفوظ ہے جسے پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے نگار لکھنو با بتہ ماہ اگست ۱۹۸۴ء میں ایک مضمون ''مرزا داغ اور منی بائی'' کے عنوان سے لکھا ہے ہم نے اسی مضمون سے روز نامچے کے اقتباس لیے ہیں۔

داغ عقدِ نکاح پر بالکل آمادہ ہو گئے تھے اور ان کے احباب اس دیوانگی کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی آغوشی بیٹی لاڈلی بیگم اور داماد سائل دہلوی اور مرزا خورشید عالم نے پریشان ہو کر داغ کے ان دوستوں سے فریاد کی جن کا اثر داغ پر تھا اور داغ ان کی بات سنتے تھے چنانچہ ان لوگوں نے داغ کو سمجھایا کہ حجاب نے آتے ہی آپ پر احتساب قائم کر دیا ہے اور آپ ابھی سے بگڑنے لگے ہیں عقد

کے بعد تو وہ اور آپ پر چھا جائے گی اور آپ کے بنائے کچھ نہ بنے گی یہ ذہن میں رکھے لاکھ بڑبس میں مبتلا ہوں مگر داغ بھی ایک ہی جہاں دیدہ تھے وہ نزاکتِ حالات کو سمجھنے لگے اور انھوں نے بلطائف الحیل عقد کو ٹالنا شروع کر دیا اس پر حجاب بگڑ گئی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا ہونے لگا، چنانچہ اس کے تصفیہ کے لیے حسن علی خاں امیر بلائے گئے اس کی تفصیل داغ کے خط میں دیکھ لیجیے۔

''نواب صاحب! زادلطفہ، آپ کو خبر بھی ہے؟ ہاں خبر ہو تو کیونکر! آپ تو معشوق کی طرح تغافل کی گود میں کھیل رہے ہیں لیجیے میں بتائے دیتا ہوں کہ حجاب آج دو روز سے روٹھی بیٹھی ہیں اپنے متعلقین کو بلانے کے لیے مصر ہیں میں نے مذاق میں انکار کر دیا اور اس سے ان کی دل شکنی ہوئی اور یہ سارا فساد اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپ ہی انھیں سمجھائیں تو سمجھیں آج چار روز سے آپ آئے ہی نہیں میں برابر منتظر رہا، پرچہ دیکھتے ہی آیئے میری مدد فرمایئے میں لاکھ سمجھاتا ہوں کہ یہ محض مذاق تھا تم اپنے متعلقین کو خوشی سے بلا سکتی ہو میرے گھر میں تو اتنی گنجائش نہیں البتہ مکان کرایہ پر لے کر انھیں رکھا جا سکتا ہے اب آپ تشریف لائیں تو سب باتیں طے ہوں وہ آپ کے آنے پر ہی شاید راضی ہوں گی۔

مسودۂ خطوط داغ مرتبہ رفیق مارہروی (بلا تاریخ)

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی حسن علی خاں نے مکان کا انتظام کیا اور حجاب دوسرے مکان میں اٹھ گئیں اور ان کے متعلقین بھی کلکتہ سے حیدر آباد آ گئے اس

طرح حسن علی خاں سے بھی حجاب کی بے پردگی ہوگئی اور وہاں بھی آنے جانے لگی گو علیحدہ مکان لے لیا گیا تھا اور حجاب کے متعلقین اس میں رہے مگر حجاب زیادہ تر داغ ہی کے مکان میں رہا کرتی تھی۔

حجاب یہ سمجھ کر حیدر آباد آئی تھی کہ داغ شاہ دکن کے استاد ہیں۔ ایک ہزار روپیہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور روزانہ سرفرازیاں لاکھوں کی ہوتی ہیں میں پہنچ کر داغ کو قبضہ میں کرلوں تو ہزار نہ سہی پانسو ماہوار تو کہیں نہیں گئے مگر ع

خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم

سارے منصوبے پادر ہوا ثابت ہوئے داغ نے حجاب کے علیحدہ مکان لینے کے بعد سے ابتدا ساٹھ روپے اور پھر سو روپیے ماہوار دینا شروع کیا یہ اس کے کنبے کو کافی نہ ہوتے تھے پھر حجاب ٹھہری ڈیرے دار طوائف کھلے ہوئے ہاتھ کی ادھر داغ کی دی ہوئی رقم آتی اور ادھر خرچ ہو جاتی داغ یوں تو نام و نمود پر بہت خرچ کرتے تھے مگر محتاط تھے اور ان کی یہ احتیاط بخالت کی حد تک پہنچ گئی تھی اس لیے حجاب پریشان رہنے لگی جس کا احساس داغ کو بھی ہونے لگا اور ان کا عیش تلخ ہوتا رہا چنانچہ انھوں نے ایک خط حسن علی خاں کو لکھا۔

''نواب صاحب مکرم! سلمہ اللہ تعالیٰ! حجاب کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں حالانکہ ان کی یہی ضروریات جب اعزہ ان کے پاس یہاں نہیں تھے تو اچھی طرح پوری ہوجاتی تھیں آئے دن سرگرداں رہتی ہیں وہ ہنسی دل لگی وہ ٹھٹول سب غائب اکثر معمولی باتوں پر اختلاف اور جھگڑا کر بیٹھتی ہیں آپ سے بارہا گزارش کرچکا ہوں کہ آپ ہی انھیں سمجھائیں میری عمر کا تقاضا یہ نہیں کہ

ان کی تلوّن مزاجی کا متحمل ہو سکوں پھر جہاں تک ہو سکتا ہے پہلو
تہی کرتا ہوں آپ اُن کے اور میرے حالات پر پوری نظر رکھتے
ہیں کچھ تو سوچئے فکر کر کے مجھے بتائے کل اختر جاں کے باب میں
دیر تک جھگڑا کرتی رہیں۔ گانا سننے کا نہ صرف مجھے شوق ہے بلکہ
موسیقی کا دیوانہ ہوں، ان ناچاقیوں میں میری یہ خواہش کیسی
پوری ہو میں آپ کا منتظر ہوں سواری بھیجتا ہوں جلد تشریف لائے

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ اُن کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

مسودۂ خطوط داغ مرتبہ رفیق مارہروی (بلا تاریخ)

اس خط پر ذرا غور فرمائے داغ کس بھولے پن سے لکھتے ہیں حجاب کی ضروریات
پوری نہیں ہوتیں حالانکہ ان کی ضروریات جب اعزہ ان کے پاس یہاں نہیں تھے
تو اچھی طرح پوری ہو جاتی تھیں غور کرنے کی جگہ ہے جو مقررہ رقم داغ حجاب کو
دیتے تھے وہ حجاب اور ان کے بھائی کی ضروریات کے لیے پوری ہو جاتی تھی اب
کلکتے سے دس پندرہ متعلقین آ گئے تھے۔ یہ رقم جو دو آدمی کے لیے پوری پڑتی تھی
اتنوں کو کیسے کفاف کر سکتی؟ مگر داغ باوجود اپنی فراست کے اس کے سمجھنے سے
قاصر تھے اور یہی بات بنائے فساد تھی۔

یہ چپقلش جاری ہی تھی کہ داغ حضور نظام کے ساتھ شکار گاہ نرسم پیٹھ چلا
گئے جنگل کی گرمی، شکار کی بے لطفی اور طبیعت کے انقباض نے بہت چڑ چڑا بنا دیا
وہاں سے جو احکام جاری ہونے لگے وہ نادری تھے، سب عشق و عاشقی حروف غلط
کی طرح مٹ گئی ساری شورہ شوری ختم ہو گئی اور بے نمکی شروع ہو گئی۔ چنانچہ نرسم

پیٹھ سے ۳ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ مطابق ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء کو حسن علی خاں کو خط لکھا۔

''......اُن (حجاب) کی گزریوں تو سو روپے مہینے میں بھی نہ ہوگی جب وہ میرے مکان میں تھیں تو گیارہ مہینے بتاتی تھیں۔ مکان دار کو معرفت عبدالحمید کے بلا کر دریافت کرو کہ تمہارا کیا لینا ہے از روئے کاغذ بتاؤ اور نصف کرایہ پر فیصلہ کرتے ہیں اگر لینا ہو تو لو اس سے زیادہ یہاں سے نہیں ملیں گے ورنہ یہ روپیہ بھی تمہارا ڈوب جائیگا، ان کے پاس روپیہ نہیں سرکار ان سے ناراض ہیں ان کی حرکتوں سے ترس کھا کہ وہ یہ دیتے ہیں نصف کرایہ پر بھی فیصلہ جب ہوگا کہ اسی وقت اُن کو مکان سے اٹھا دو''۔

(انشائے داغ ص: ۷۶، ۷۷)

لیجئے اب گھر سے نکال باہر کرنے کا حکم ہو گیا، اس کے تیسرے ہی روز ایک اور خط لکھا۔

''نواب صاحب تغافل شعار! سلمہ اللہ تعالیٰ تین دن سے خط کا منتظر ہوں جواب ندارد، لفظ بی جو شرفا کے واسطے ہے اس پر خفا ہیں میں نے خوب جھاڑا ہے کچھ روپیہ لڑکی سے لیا پچاس یہاں سے گئے...... سے آپ سے مانگتی ہیں ذرا ان کو جھاڑیئے گا میں نے جوان کو خط لکھا ہے وہ انا کے خط میں ہے اس کو انا سے لے کر آپ پہنچا دیں تو بڑی عنایت، ایک غزل ملفوف اور بھیجتا ہوں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ پہلی سب غزلیں مبیضہ میں صاف چڑھ گئیں کہ ابھی کوئی باقی ہے۔ یہاں خیریت ہے گرمی کی شدت ہے، بچوں کو

دعا کہیے۔		(۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ، ۲ جون ۱۹۰۳ء)

اوپر کے خط میں اتا کے ذریعہ جس خط کو بھیجنے کا ذکر کیا ہے غالباً وہ خط یہی ہے دیکھئے کتنا کاروباری خط ہے دلدار و دلنواز مہربان، قدرداں جان ایماں سے اترتے اترتے معاملہ جناب من تک پہنچ جاتا ہے۔

"جناب من! میرا جو منشا ہے وہ نواب صاحب کی زبانی کہلوا چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھ سے امید نہ رکھو مکان کا کرایہ میرے ذمے، تمہارے ملبوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمے تو پھر سو روپیہ تمہارے لیے کیوں کافی نہیں ہیں۔ اِدھر اُدھر سے قرض لینا اچھا نہیں خود ذلیل اور میں مطعون ہوتا ہوں ان لوگوں سے جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں دوسرے پر بار بننا کسی طرح مناسب نہیں۔

خدا بخش تاریخ ورود سے بے تعلق ہے اس کو میرے متعلق سمجھو اس کی آمد و رفت تمہارے یہاں میرے منشا پر ہے ورنہ وہ خود تم سے شا کی ہے اور ذرا بھی تمہارا روادار نہیں، یہ چلن، محاسبہ دل میں کرو کیا گنجائش دلوں میں پیدا کر سکتے ہیں نواب صاحب آئیں تو بھیجوں، تمہاری باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں یکا یک جو تغیر ہو گیا ہے اس کی وجہ خدا کے سوا کسے معلوم ہو سکتی ہے۔ نواب صاحب سے کل امور پر صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کرو، اگر کلکتے کی واپسی چاہتے ہو تو کھل کر بتاؤ مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ ہر چیز تمہاری مرضی پر ہے اور اب بھی ہو گی ناراض ہو کر جانا منظور

ہے۔ تو کون روک سکتا ہے۔ مسودۂ خطوط داغ مرتبہ رفیق مارہروی (بلا تاریخ)

خدا بخش حجاب کے چھوٹے بھائی تھے جسے داغ بہت پسند کرتے تھے اور جب حجاب الگ گھر لے کر جا رہیں تو داغ نے خدا بخش کو اپنے پاس ہی رکھا مگر وہ حجاب کے پاس روزانہ آتے جاتے تھے دوسرے معنی میں داغ کی طرف سے حجاب کی نگرانی کرتے تھے جب حجاب کلکتہ چلی گئی تو یہ حیدرآباد ہی میں رہ گئے۔ آخر عمر میں انھیں میں نے بھی دیکھا ہے رنڈیوں کو تعلیم دیا کرتے تھے فن داں اور غریب طبیعت کے آدمی تھے حیدرآباد ہی میں مرے۔

داغ کا عملی آدمی ہونا اس سے ثابت ہے کہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ لوگ دوسرے کی کمائی پر گزارہ کریں چنانچہ انھوں نے اُن لوگوں کو جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں لکھ کر اپنا منشا ظاہر کر دیا ہے۔ پھر خود ہی داغ نے اشارتاً کلکتے کی واپسی کی رہبری بھی کر دی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ دل بھر گیا تھا۔

ایک خط برادرم یٰسین علی خاں کے پاس حجاب کا ہے جسے آپ بھی دیکھ لیجئے۔ یہ داغ کے نام ہے اب تک داغ کے خطوط آپ نے حجاب کے نام دیکھے تھے اب ایک حجاب کا خط بھی داغ کے نام دیکھ لیجئے مگر افسوس ہے کہ یہ آخری زمانے کا خط ہے جب کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے متنفر ہوگئے تھے۔

''مہربانا! سلامت رہیے تین خط روانہ کر چکی ہوں جواب نہیں ملا روپیہ بھی منگوایا تھا وہ بھی نہیں ملا، آخر میرا خرچ کس طرح اٹھے خدا جانے اُسے کتنے ملے مجھے تو اتنا نے صرف سودئے اور یہ تاکید بھی کی کہ زیادہ کی امید نہ رکھوں میں آپ کے گھر والوں سے

سخت ناراض ہوں مجھ سے دشمنی کر کے بانٹ لیں گے...... خدا میرے دشمنوں کو غارت کرے''۔ یکم ربیع الاول ۱۳۲۱، (۱۸ جون ۱۹۰۳)

یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ ۴ اگست ۱۹۰۳ء کو حجاب جس مکان میں رہتی تھیں وہ گرا اور وہ داغ کے گھر پہنچ گئی چنانچہ اس کی اطلاع داغ نے حسن علی خاں کو اس طرح دی۔

''...... بی حجاب کل سے وارد ہیں اور آپ کی مشتاق ان کا مکان گرا جان بچ گئی اس کی مرمت ہو رہی ہے یہاں تو کہیں ٹھکانہ نہیں۔ (۷ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ، ۵ اگست ۱۹۰۳)

اس کے بعد کوئی خط نہ تو داغ کا حجاب کے نام مل سکا اور نہ حجاب کا داغ کے نام، معلوم ہوتا ہے کہ اگست کے بعد ہی یا اسی مہینے میں حجاب کلکتہ واپس ہو گئیں اور یہ معاشقہ داغ اس حزینہ پر ختم ہو گیا۔

مثنوی فریادِ داغ شاعری کے اعتبار سے بڑی اچھی ہے۔ اور مثنوی کی حد تک جتنے واقعات ہیں وہ بھی دلپذیر ہیں مگر بعد کے واقعات نہایت دلگداز اور روح فرسا ہیں۔

داغ نے حجاب کو بدمزگی کے ساتھ رخصت تو کر دیا مگر ان کے دل میں خلش رہی اور وہ اس کی روانگی سے بہت متاثر رہے چنانچہ حجاب کے جانے کے بعد سے داغ نے گانا سننا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ عطر کا شوق بھی کم ہو گیا تھا اور کھانا تو قریب قریب چھوٹ ہی گیا تھا۔ دوستوں اور شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اب مجھے کسی بات کا لطف نہیں آتا، منہ کا ذائقہ نہیں رہا۔ قوت شامہ مفقود ہو گئی ہے کسی بات میں مزا نہیں آتا۔ اسی طرح داغ نے سال بھر گزارا اور ستمبر ۱۹۰۴ء سے بیمار ہی ہو گئے اور یہ سلسلہ اتنا طول کھینچا کہ پانچ چھ مہینے مسلسل بیمار رہ کر ۱۵ فروری

۱۹۰۵ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو عید کی نماز کے ساتھ نماز جنازہ حیدر آباد کی سب سے بڑی مسجد ''مکہ مسجد'' میں ہوئی اور درگارہِ یوسفین میں سپردخاک ہوئے ع

داغؔ! تجھ کو باغِ جنت ہو نصیب!

فریاد داغ

پروفیسر گیان چند جین

نواب مرزا داغ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں مثنوی فریاد داغ لکھی۔ جلوۂ داغ کے مطابق یہ نظم محض دو دن کا کارنامہ ہے۔ مثنوی کا نام تاریخی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن[1] اخبار نیّر اعظم مراد آباد کے دفتر سے ۳ / اپریل ۱۸۸۵ء/۱۳۰۲ھ کو شائع ہوا۔ پندرہ سو کاپیاں تھیں جو مہینہ بھر[2] میں فروخت ہوگئیں۔ کچھ عرصہ بعد دوسرا ایڈیشن چھپا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۹۵ء/۱۳۱۲ھ میں چوتھا ۱۸۹۹ء پانچواں جولائی ۱۹۱۳ء میں نکلا۔ ۱۹۵۶ء میں تمکین کاظمی صاحب نے ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا بہتر ایڈیشن پاکستان سے شائع ہوا۔ اس مثنوی میں ۱۸۳۸ اشعار ہیں۔ مولانا عرشی نے اپنے ایک مضمون[3] میں اس مثنوی کی شانِ نزول پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نوٹ کا خلاصہ یہ ہے:

''نواب کلب علی خاں نے مارچ ۱۸۸۶ء میں باغ بے نظیر کے

۱۔ تمکین کاظمی صاحب فریاد داغ کے مقدمے میں ص: ۳۴ پر پہلی اشاعت کی تاریخ ۱۸۸۳ء لکھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ پہلا ایڈیشن اسٹیٹ لائبریری رامپور میں ہے۔ بعد کی اشاعتوں میں بھی اول کی متعدد تاریخیں درج ہیں۔ جن سے ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

۲۔ خطوط داغ از عرشی صاحب اردو ادب ستمبر ۱۹۵۶ء

۳۔ ایضا داغ کا خط حجاب کے نام اردو ادب ستمبر ۱۹۵۶ء

میلے کا اجرا کیا۔ یہ میلہ آٹھ دن تک رہتا تھا۔ غالباً ۱۸۷۹ء میں میلے میں صاحبزادہ حیدرعلی خان برادر خورد کلب علی خاں نے کلکتہ کی طوائف منی بائی حجاب کو بلایا۔ داغ اس کو دل دے بیٹھے لیکن چونکہ صاحبزادے سے اس کے تعلقات گہرے تھے اس لیے اس وقت کچھ نہ کہا۔ اگلے سال داغ نے حجاب کو رام پور میں آنے کی دعوت دی مگر صاحبزادے نے ممانعت کردی۔ داغ نے صاحبزادے کی خوشامد کرکے حجاب کو بلوالیا۔ حجاب صاحبزادے کے پاس ٹھہری۔ لیکن انھوں نے حجاب و داغ کے تعلقات کی بنا پر حجاب کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ حجاب وہاں سے خفا ہوکر داغ کے یہاں آ گئی اور دو مہینے رہ کر کلکتہ واپس چلی گئی"۔

فریادِ داغ میں جس رقیب کا ذکر ہے وہ حیدرعلی خان ہیں۔ کلکتہ میں لوگوں نے حجاب کو بھڑکایا کہ داغ کو کلکتہ بلاؤ۔ اگر عاشق صادق ہے تو آئے گا۔ داغ کو نواب نے چھٹی نہ دی۔ انھوں نے حجاب کو معذرت کا خط لکھا۔ آخر نواب نے ان کا حالِ زار دیکھ کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ دلّی، لکھنو، کانپور، الہ آباد، پٹنہ ٹھہرتے کلکتہ پہنچے۔ کچھ روز وصل کے مزے لیے تھے کہ ماہِ رمضان آیا۔ رئیس کی طرف سے طلبی آئی۔ آخر رامپور واپس آئے۔ یہاں انھیں ہجر میں حواس باختہ دیکھ کر دوستوں نے مذاق اُڑایا۔

مندرجہ بالا واقعات بالکل صحیح ہیں۔ تمکین کاظمی صاحب نے مقدمہ فریادِ داغ، میں صفحہ ۱۹ پر حجاب کے دوبارہ رام پور آنے کی تاریخ مارچ ۱۸۸۲ء لکھی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اپریل ۸۲ء میں داغ کلکتہ کے لیے چل پڑے تھے۔

عرشی صاحب کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مارچ ۸۰ء کا ذکر ہے۔ ممکن ہے ۸۱ء کا واقعہ ہو۔ کیوں کہ آئندہ سال داغ کلکتہ گئے۔ ''انشاء داغ سے بھی داغ کے سفر کی تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عرشی صاحب نے اس کی صحیح تفصیل درج کردی ہے۔ داغ رام پور سے چھٹی لے کر اپریل ۱۸۸۲ء/ ۱۲۹۹ھ میں سفر کلکتہ کے لیے دلّی روانہ ہوئے۔ ۷ مئی ۱۸۸۲ء کو پٹنہ[1] سے خط لکھا ہے اسی مہینے کلکتہ پہنچے۔ ۲۹ شعبان ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۸۸۲ء کو رام پور واپس ہوئے۔

عرشی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منی بائی عرف منجھلی کو مختلف تذکروں میں منشی شوکت صاحب، نساخ اور عصمت اللہ النخ کا شاگرد بتایا ہے۔

''انشائے[2] داغ'' کے ایک خط اور نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاب نے داغ کو خط لکھا کہ:

> ''میں اب منہیات سے تائب ہوگئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی کے عقد میں آ کر پردہ نشین ہو جاؤں''۔

داغ نے اسے حیدر آباد بلایا وہ اس شرط پر آئی کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے سامنے نہ آؤں گی۔ چنانچہ ۲ فروری ۱۹۰۳ء کو قاضی عبدالحمید کلکتہ والے کو لکھتے ہیں:

> ''بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہنچیں۔ میرا مکان بھی

---

1. ''انشائے داغ''، ص: ۵۰، ''فریاد داغ'' کے مقدمہ میں ص: ۴۲ پر تمکین صاحب لکھتے ہیں کہ حجاب دوسری بار مارچ ۱۸۸۲ء میں رام پور آئی، اور داغ جون ۱۸۸۳ء میں کلکتہ پہنچے۔ ظاہر ہے کہ انھیں ایک سال کا سہو ہوا ہے۔ ص: ۲۴ اور ص: ۴۳ پر داغ کے سفر کی صحیح تاریخ ۱۸۸۲ء درج ہے۔
2. انشائے داغ ص: ۵۱

آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے۔ میں رند خراباتی وہ زاہد
مناجاتی۔ دیکھیے کیا ہو۔ ابھی تک مجھ کو اس پردہ میں معلوم نہیں ہوا
کہ وہی ہیں یا کوئی اور؟

آخر حجاب ٹوٹا۔ داغ کی شوریدگی عشق کدورت اور کراہت میں بدل گئی۔ یہ حجاب
کی شرائط پر رضامند نہ ہوئے اور وہ کلکتہ واپس چلی گئی۔

"فریادِ داغ" میں محبوبہ کا نام صاف صاف نہیں لکھا لیکن در پردہ کئی
شعروں میں اس کا تخلص لے آئے ہیں۔

شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی　　لن ترانی جواب میں کیسی

جا کے عہدِ شباب کا آنا　　تھا دو بارہ حجاب میں آنا

داغؔ کی یاد میں حجاب رہے　　ساتھ شوخی کے اضطراب رہے

یا الٰہی نجات غم سے ملے　　وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

"سب رس" حیدرآباد بابت دسمبر ۱۹۶۰ء میں فاضل زیدی صاحب کا
ایک مضمون شائع ہوا ہے "مثنوی فریادِ داغؔ" کی شانِ نزول بقول "لاڈلی بیگم"
داغؔ کی آغوشی دختر ہیں۔ فاضل صاحب ان سے ۲۷ فروری ۵۸ء کو لاہور میں
ملے۔ لاڈلی بیگم کا بیان ہے:

"نواب کلب علی خاں اپنے سوتیلے بھائی صاحبزادے حیدر علی
خاں اور حجاب کے تعلقات سے ناخوش تھے۔ داغؔ نے ان
دونوں میں پھوٹ ڈلوا دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے
بہروپ دھر کر حجاب پر اپنا عشق ظاہر کیا۔ ایمائے شاہی پر اگلے

سال اسے رام پور بلایا اور پھر نواب کی تحریک پر کلکتہ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب دیکھ کر حیدر علی خان حجاب سے ہمیشہ کے لیے بددل ہو گئے۔ نواب نے داغ کو حکم دیا کہ اس داستانِ عشق کو بہ صورت مثنوی نظم کر کے مشتہر کرادو تاکہ حیدر علی خان پھر کبھی اس طرف راغب نہ ہوں۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ داغ صاحب کو یہ ناگوار فرض بھی ادا کرنا پڑا۔ یعنی اس فرضی محبت کی مثنوی بھی کہنی پڑی۔ نہایت بے دلی کے ساتھ دو ہی دن میں مثنوی کہہ کر حاضر کر دی"۔

سوال کیا گیا کہ پھر حجاب داغ کے پاس حیدر آباد کیوں کر پہنچ گئی۔ جواب ملا کہ اہلیہ کی وفات سے داغ کو چپ لگ گئی۔ ان کا دل بہلانے کے لیے احباب نے حجاب کو بلا بھیجا۔ بلکہ نکاح کے لیے اصرار کیا۔ داغ راضی ہوئے لاڈلی بیگم نے داغ کو عتاب شاہی سے ڈرایا جس کی وجہ سے داغ اپنے ارادے سے باز رہے۔ بالآخر حجاب کلکتہ چلی گئی۔

فاضل زیدی اس بیان کو تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ جو داغ کی سوانح اور سیرت سے واقف ہے وہ اسے داغ کی شاہد بازی پر پردہ پوشی کی ایسی معصوم کوشش قرار دے گا جو کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ اس سلسلے میں "بزمِ داغ"[1] ملاحظہ ہو۔ یہ وہ ڈائری ہے جس کو احسن اور افتخار عالم مارہروی لکھا کرتے تھے۔

حیدر آباد میں داغ کے دماغ پر دیوانگی کا جو دورہ پڑا تھا اس کی تفصیل بزمِ داغ کے اوراق میں ملاحظہ ہو۔ اس وقت تو نواب کلب علی خاں زندہ نہیں تھے۔ یہ بھی غلط ہے کہ حجاب کو حیدر آباد بلانے کے محرک داغ کے احباب تھے۔

---

[1] بزمِ داغ از رفیق مارہروی ص: ۱۸۸

داغ نے ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو حجاب کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا بلکہ احسن سے لکھایا۔ جس میں آخری جملہ یہ ہے۔

''مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے لکھو کہ کب آ رہی ہو''

یہی خط زبانِ داغ میں شامل ہے۔ لیکن وہاں اس کی تاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۰۲ء درج ہے۔ ہمارے لیے تاریخ کا یہ فرق اہم نہیں اس خط کا ناشکیبانہ لہجہ اور الفاظ اہم ہیں۔

لکھنوکی بہترین زبان مرزا شوق نے لکھی ہیں۔ دلّی کی زبان کی معراج نواب مرزا داغ کے یہاں ہے۔ فریادِ داغ کا مایہ فخر زبان ہے۔ زبان کے علاوہ اس میں کوئی خوبی نہیں اس میں عشق اور ہجر کا بیان ہے۔ لیکن سوز و برجستگی کا پتہ نہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ عاشق کوئی طرار، فقرہ باز، لیکن متین معزز اور خود اعتماد قسم کا شاہد باز ہے۔ محبوبہ اس شوکت و حشم کی مطربہ ہے کہ محض خواص سے ارتباط رکھتی ہے۔

مثنوی کی ابتدا میں حمد و نعت کے فریضے کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہتے ہیں:

سب اسے رام پور کہتے ہیں ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

کلکتہ میں جب انھیں نواب کا بلاوا آیا تو واپس جانا پڑا۔ اس موقع پر ایک شعر لکھا ہے۔

اس طرح کس طرح سے رہ جائے ہوئے باون برس نمک کھاتے

اخبار الصنادید کے مطابق [۲] داغ ۱۴؍اپریل ۱۸۶۶ء ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ کو رام پور

---

[۱] زبان داغ ص: ۱۸۳

[۲] خطوط داغ از عرشی صاحب اردو ادب ستمبر ۱۹۵۶ء

میں ملازم ہوئے۔ مندرجہ بالا شعر کی تحریر کے وقت نواب کی ملازمت میں انھیں صرف ۱۷ سال گزرے تھے لیکن ان کی عمر ۵۲ سال ۹ مہینے نمک خوار ہونا محض شاعرانہ احسان شناسی ہے واقعہ نہیں۔

مدح نواب کے بعد مثنوی میں توصیف عشق ہے۔ اس میں سوز و گداز یا حسرت و یاس کے مضامین نہیں۔ بلکہ عشق کو ذریعہ لذت اور اخلاق آموز مانا ہے۔

دل بنا ہے اسی مزے کے لیے　　میں نے یہ لطف جان دے کے لیے
دل اسی سے جوان رہتا ہے　　مرمٹوں کا نشان رہتا ہے
عشق کیا کیا بہار دیتا ہے　　یہ دلوں کو اُبھار دیتا ہے
عشق سے آدمیت آتی ہے　　آدمی کو مروّت آتی ہے

یہ مثنوی واقعہ نگاری میں بہت کمزور ہے۔ داغ غزل گوئی کے عادی تھے۔ مثنوی کا تسلسل ان کے بس کا نہ تھا۔ محبوبہ سے پہلی ملاقات پر فریقین کے جذبات اور کلکتہ میں وداع کے موقع پر حسرت و ارمان کا اظہار بڑے ڈرامائی موقع تھے لیکن یہ بالکل پہلو تہی کر گئے۔ بے نظیر کے میلے میں پہلی بار حجاب کو دیکھتے ہیں تو اس کا سراپا پیش کرتے ہیں۔ سراپا کے سلسلے میں وصل کا بیان کرنے لگتے ہیں بیچ کی سب کڑیاں غائب ہیں۔ کوئی ذکر نہیں کہ میلے سے جانے کے بعد کب ملاقات ہوئی اور کیسے وصل ہوا۔ فراق صاحب[1] کو بھی اس نقص کا احساس ہے۔

مضبوط و مربوط تسلسل بیان کے لحاظ سے واقعہ نگاری کے لحاظ سے لکھنویت و افسانویت کے لحاظ سے پوری مثنوی بحیثیت مجموعی کافی پھسپھسی اور کچے دھاگے کی طرح کمزور رہ جاتی ہے۔ حجاب کے سراپا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

---

[1] اردو کی عشقیہ شاعری از فراق ص:۵۴

گات بانکی بدنی سڈول تمام فتنہ قد فتنہ چشم، فتنہ خرام

نگہہ مست ہوشیاری سے لڑنے والی چھری کٹاری سے

وہ اکتی ہوئی نظر آہا وہ لچکتی ہوئی کمر آہا

کبھی کچھ تیوری میں بل دینا کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

اپنے سائے سے پوچھنا تو کون ہے مرے ساتھ دوسرا تو کون

محبوبہ کے جانے پر اپنی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

کسی کروٹ سے کل نہیں آتی نہیں آتی اجل نہیں آتی

جی بہلتا نہیں کسی صورت دم نکلتا نہیں کسی صورت

ضعف سے دونوں مل گئے پہلو چین بستر سے چھل گئے پہلو

تپ دوری نچوڑتی ہے مجھے دم بدم روح چھوڑتی ہے مجھے

ضعف سے قلب تھرتھراتا ہے درد بھی اُٹھ کے بیٹھ جاتا ہے

دل کی حالت بری ہے سینے میں سانس چلتی چھری ہے سینے میں

شاید یہ بدگمانی داغ کے کردار سے واقفیت کی بنا پر ہو۔ ان اشعار میں خلوص کی کمی نظر آتی ہے۔

داغ کو کلکتہ پسند آیا۔ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ آخر وہاں وصل کے دولتِ بیدار ہاتھ آئی تھی سیر کیجئے۔

صبح سے شام تک جمال کے لطف شام سے صبح تک وصال کے لطف

غم کی راتیں، نہ تھے ملال کے دن کیا پھرے تھے شب وصال کے دن

مسکراتے تھے لب جو دلبر کے کھلے جاتے تھے پھول بستر کے

خود بخود دل کھلا ہی جاتا تھا قہقہہ لب پہ آہی جاتا تھا

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
آتشِ حسنِ یار کی گرمی بزم میں ایک بہار کی گرمی

اس مثنوی کے لیے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

''اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور سادگی، روانگی و عمدگی اُن کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔

تمکین صاحب[2] کا خیال ہے کہ رام بابو سکسینہ یا کتاب کے اردو مترجم محمد عسکری نے فریادِ داغؔ پڑھ کر یہ رائے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سطور مثنوی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ عاشق معشوق کی تصویر سے تخاطب نہیں کرتا۔ بلکہ محبوبہ عاشق کی تصویر سے گفتگو کرتی ہے۔

تجھ سے رونق نہیں ہے گھر کے لیے رکھ لیا ہے نظر گزر کے لیے

دوسری بات یہ ہے کہ اس مثنوی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو متانت یا تہذیب سے گرا ہوا ہو، یا جس میں خراب جذبات کی تصویریں ہوں۔

فریادِ داغؔ دلّی کی آخری مشہور مثنوی ہے۔ زبان، بیان اور جذبات کے لحاظ سے حکیم شوق کی مثنویوں کے قریب آجاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں بے حیائی سے کام نہیں لیا گیا۔

---

1. تاریخ ادب اردو ص:۴۳۱
2. مقدمہ فریادِ داغؔ ص:۳۵ طبع اول

داغ کی مثنوی

سید محمد عقیل رضوی

قدیم شعرا کے کلام کے لیے جس طرح قلمی اور غیر مطبوعہ نسخوں کی تلاش ہوتی ہے اور اس میں طرح طرح کی قیاس آرئیاں ہوا کرتی ہیں اسی طرح داغ کی مثنویوں کے متعلق بھی مختلف قسم کے شبہات اب بھی موجود ہے۔ ایک طبقہ ہے جس کا خیال ہے کہ داغ کی بہت سی مثنویاں ابھی شائع نہیں ہوسکیں اور نہ ان کا پتہ چلتا ہے۔ مگر یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ داغ کا جتنا بھی کلام شائع ہو چکا ہے اور سامنے ہے اس میں ان کی صرف ایک مثنوی ہے جو فریاد داغ کے نام سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ مگر مختلف کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ داغ نے یہ مثنوی شائع ہونے سے چار سال پہلے لکھا تھا۔ اس ایک مثنوی کے علاوہ ہمیں کسی تاریخ یا کسی دوسری کتاب میں کسی دوسری مثنوی کا پتہ نہیں چلتا۔ داغ کے کل اشعار کی تعداد علاوہ مثنوی کے چودہ ہزار نو سو چہتر بتائی جاتی ہے اور اس مثنوی کے اشعار کی تعداد آٹھ سو اڑتیس ہے۔ ان اشعار کو ملا کر کل مطبوعہ اشعار کی تعداد ۱۵۸۱۵[1] ہو جاتی ہے۔ اگر یہ تعداد صحیح ہے تو اس میں صرف یہی ایک مثنوی ملتی ہے۔ داغ کا کچھ کلام غدر میں ضائع ضرور ہوا مگر اس میں کوئی اچھی مثنوی ہوتی تو ضرور مشہور ہوگئی ہوتی۔ بعد میں جب داغ نے اپنی یاداشت

[1] داغ دہلوی مصنفہ نور اللہ محمد نوری ص: ۹۱ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدر آباد دکن۔

سے ضائع شدہ غزلوں کو پھر سے مرتب کیا تو مثنوی گمشدہ کا تذکرہ ضرور کرتے۔

داغ کے مکتوبات، تحریروں اور دوسرے ابتدائیہ میں جہاں تک مجھے مل سکے، میں نے اچھی طرح تلاش کیا ہے۔ مجھے کسی مثنوی کا اشارہ یا تذکرہ نہیں ملا۔ خیال ہے کہ اس مثنوی کے علاوہ داغ نے کوئی دوسری مثنوی نہیں کہی۔

فریاد داغ، داغ کی آپ بیتی ہے جس میں داغ اور کلکتہ کی ایک طوائف منی بائی متخلص بہ حجاب کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ حجاب ایک مرتبہ رام پور بے نظیر کے میلے میں شرکت کے لیے آئی[1] وہیں داغ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ کچھ دنوں تک داغ کے ساتھ وہ رام پور میں رہی اس کے بعد کلکتہ واپس چلی گئی۔ داغ اس کے ہجر میں بے قرار رہتے۔ اسی بے قراری میں ایک اور مصیبت نازل ہوتی ہے۔ حجاب کو کلکتہ میں داغ کے رقیب ورغلاتے ہیں کہ داغ بے مروّت ہے اس کا عشق محض ہوس ہے۔ اگر اسے تم سے عشق ہے تو اُسے کلکتہ بلا بھیجو۔ آئے جب ہم جانیں کہ اُسے تم سے عشق ہے حجاب، داغ کو دعوت نامہ بھیجتی ہے ادھر داغ کی یہ مشکل کہ وہ نواب رام پور کے ملازم ہیں اور نواب انھیں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ بڑی مشکل سے رخصت ملتی ہے اور وہ کلکتہ جاتے ہیں۔ رامپور سے کلکتہ جاتے وقت جو نقشہ داغ اپنی مثنوی میں پیش کرتے ہیں اس میں وہ لہک ہے جو کسی قیدی کے آزاد ہونے میں پائی جاتی ہے گو داغ رامپور سے جدا ہونا اپنے لیے باعث قلق بتاتے ہیں۔

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو	پر چلے ہیں قلق اُٹھانے کو
ہم کو کچھ آرزوئے مال نہیں	اس کا واللہ کچھ خیال نہیں

---

[1] مثنوی فریاد داغ

مگر مثنوی میں واقعات اور بیانات کے نقشے ان کی شگفتہ دلی پر دلالت کرتے ہیں۔عظیم آباد کے اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم، وہاں کی گرمی، میرزا شاغل اور میر باقر کے تذکرے، برسات کی آمد سب کا تذکرہ داغ بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔ گو اِن کا دل رامپور چھوڑنے کو نہیں چاہتا مگر کلکتہ جانے کے لئے عظیم آباد میں وہ ساون کا انتظار کرتے ہیں۔

حالانکہ داغ کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کا ماحول اور افتادطبع بہت رنگین تھی داغ کی ساری زندگی شاہد بازی میں گذری مگر ان کی مثنوی میں کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ملتا جسے دیکھ کر شرم وحجاب کی آنکھیں جھپک جائیں۔مومن اور آثر کی دبی ہوئی جنسیت کا داغ کے یہاں کوسوں پتہ نہیں۔اس میں شک نہیں کہ ان کے مصرعوں اور اشعار میں نوجوانی چہکارتی ہے مگر کہیں ایسی عریانی نہیں ہے جو پڑھتے وقت گردوپیش پر نظر احتیاط ڈالنے پر مجبور کرے۔وصال کی آخری منزلیں اس سے آگے نہیں بڑھ پائیں۔ملاحظہ ہو۔

صبح سے شام تک جمال کے لطف	شام سے صبح تک وصال کے لطف
وصل کی شب میں جلوے تھے دن کے	سرمہ تھی حلق میں موذن کے[1]
عیش وعشرت کی بات بات اچھی	رات سے دن تو دن سے رات اچھی
محفل عیش کا بندھا وہ سماں	دیکھے پھر پھر کے جس کو عمر رواں

یہ ضرور ہے کہ ان کی بیباکی، جلی کٹی باتیں، چھیڑ چھاڑ، بدگمانی، جیسی کہ ان کی تمام شاعری میں نظر آتی ہے اسی طرح ان کی مثنوی میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں وہ ہجر کا تذکرہ کرتے ہیں اس تذکرے میں بے بسی کی تڑپ نظر نہیں آتی۔اس کا

1۔ مثنوی میں یہ مصرعہ اسی طرح ہے معلوم نہیں 'سرمہ' کو داغ نے مونث کیوں لکھا ہے۔ملاحظہ ہو فریاد داغ ص:۴۳

سبب خواہ داغ کے کلام کو چونچال پن ہو یا تیکھا پن۔ وہ ہجر میں تڑپتے ہیں تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ضد، رنج و افسوس ایک بچے کا ہے جو ضد کرتے وقت صاحب معاملہ پر احسان غصہ اور جس چیز کے لیے ضد کر رہا ہے اسے پا لینے کی خواہش کا اثر چھوڑنا چاہتا ہے۔ داغ وصل کے طالب ہوتے ہیں تو بیکسوں اور گداگروں کی طرح نہیں۔ ان کے یہاں ایک برتری کا احساس قائم رہتا ہے۔ جو انھیں کی زبان سے جیسے رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں" کی کیفیت کا اظہار کر رہی ہو۔ اس طرح ان کی مثنوی میں بھی ان کی غزلوں جیسے تیور موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ اشعار میرے ان خیالات کو صاف طور پر واضح نہ کر سکیں مگر داغ کا انداز بیان اور اس کا اثر جو سامعہ پر ہوتا ہے اس سے غالباً ہر سننے والے کا احساس سماعت یہی محسوس کرے گا۔

کیوں فلک انتہائے جور بھی کچھ	ظلم باقی رہا ہے اور بھی کچھ
یوں کسی کو ہلاک کرتے ہیں	یوں جلاتے ہیں خاک کرتے ہیں
ہمہ تن یاس کر دیا تو نے	ستیا ناس کر دیا تو نے

جیسے اشعار میں دھمکیاں، جھنجھلاہٹ اور شکایت کی وہ شدت ہے کہ ہجر کی تکالیف کی رویں سست نظر آنے لگتی ہیں۔ اور جب غم کی شدت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو داغ مجہولیت سے اسے بہتر سمجھتے ہیں کہ دوٹوک فیصلہ ہو جائے۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے	وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے	اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

اور مثنوی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔

داغ بحیثیت مثنوی نگار

محمد علی زیدی

داغ کی تقریباً تمام تر توجہ صنف غزل کی طرف تھی۔ اسی میں بیشتر انھوں نے زورِ کلام، لطفِ ادا، موزونی طبع، حسن بیان اور شرینی زبان کے جوہر دکھائے۔ یہ وجہ ہے کہ اُن کی شہرت کا زیادہ تر دارمدار اُن کی غزل گوئی پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محض غزل کے شاعر تھے اور شاعری کے دوسرے اقسام کی طرف انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی یا اُن سے انھیں دِلی رغبت نہیں تھی۔ غزلوں کے علاوہ اُن کے کلام میں دیگر اصنافِ سخن کا بھی وافر ذخیرہ ہے۔ اِن تخلیقات میں ایک مثنوی، ایک مسدس، ۴۲ رباعیات، ۸ مخمسات، ۱۰ قصائد، ۱۰۹ تاریخی قطعات، ۷ غیر تاریخی قطعات، ۶ سہرے، ۳ سلام اور بہت سے متفرق اشعار ہے۔

داغ نے صرف ایک مثنوی فریاد داغ لکھی تھی۔ اس میں کلکتہ کی ایک طوائف منی بائی حجاب سے اپنے معاشقے کی داستان کلکتہ کے سفر سے واپسی کے بعد جولائی ۱۸۸۲ء میں نظم کی تھی۔ یہ مثنوی اُن کی دو دن کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ احسن مارہروی لکھتے ہیں۔

> ''زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریاد داغ جیسی بے مثل مثنوی صرف دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے''۔[1]

---

[1] جلوۂ داغ ص:۱۱۴

فریادِ داغؔ متعدد بار طبع ہوئی۔ اس سے اس کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بھی موجود ہیں[1] تمکین کاظمی لکھتے ہیں۔

''فریادِ داغؔ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں کہی گئی ہے یعنی جولائی یا اگست ۱۸۸۲ء میں مگر اس کا نام داغؔ نے دو تین مہینے کے بعد ماہِ محرم ۱۳۰۰ھ میں رکھا ہے جو تاریخی نام ہے۔ اور اسی سال اس کی طباعت بھی ہوئی[2] ہے''۔

فریادِ داغؔ پہلی مرتبہ[3] محمد امجد علی مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد نے اپنے مطبع مطبع العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کی۔ اس پر مندرجہ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے۔

گفت تسلیم سالِ طبع او　　آفتِ دین فتنہ آرائی
۱۳۰۰ھ

صاحب مطبع نے پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں اور وہ بہت جلد فروخت ہوگئیں۔ داغؔ نے اپنے مکتوب بنام منی بائی حجاب میں تحریر کیا ہے:۔

---

۱ فریادِ داغؔ کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ یہ ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے لیکن کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ اس پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ جو غالباً داغؔ کی ہے۔ اس مخطوطہ میں مثنوی کے آخری دو شعر جو تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں پائے جاتے ہیں نہیں ہے دونوں شعر مندرجہ ذیل ہے۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے　　وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے　　اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

۲ داغ از تمکین کاظمی ص:۹۳

۳ یہ ایڈیشن صولت پبلک لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

''مثنوی تمہاری تھی۔ تمہارے حال کی تھی۔ تمہارے صفات کی تھی۔ میں نے تو وہ حال واقعی موزوں کر دیا ہے۔ کیا خبر تھی کہ بی حمیدن نالائق ٹھہرائیں گی اول تو میں یہ نہ سمجھا تھا کہ اُن کو میرے کلام سے شوق بھی ہے اور مثنویاں صحیح ہو رہی ہیں۔ اُن کے حصے کی مثنوی پہلے جائے گی...... ظالم ترے دل میں اثر تو کرے صلہ دلوایئے باتیں نہ بنایئے۔ شیریں جان کے حصے کی مثنوی حکیم صاحب کو دید یجئے مجھ کو کیا غرض ہے کہ شیریں جان کو بطور خود بھیجوں۔ صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں مہینہ بھر میں فروخت ہوگئیں۔ مگر چھپیں گی خدا جانے اس مثنوی کا اثر تم نے کیا دیکھا مجھ پر تو چار طرف سے بوچھار ہے اور اشتیاق ہے جو اس کلام کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ مرزا داغ سلامتی سے سولہ برس کے ہوں گے'' ۔[1]

دوسری مرتبہ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔ محمد فیروز شاہ خان فیروز نے مندرجہ ذیل قطعہ سے سالِ طباعت برآمد کیا ہے۔

وہ ہیں مضمون عالی مثنوی میں	کہ حاصل جس سے معنی کو بلندی
چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم	لکھی تاریخ ''نظم درد مندی''

۱۳۰۲ھ

تیسری[2] مرتبہ یہ مثنوی امجد علی نے مراد آباد سے ۱۳۱۳ھ میں شائع کی۔ فیروز کے

[1] زبانِ داغ ص: ۱۸۹و۱۹۰

[2] یہ ایڈیشن پبلک لائبریری جے پور میں موجود ہے۔

حسب ذیل قطعہ سے اس کا سال طباعت نکلتا ہے۔

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع — مثنوی وہ جو روح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروز — مثنوی یہ ہے یا گل تر ہے

۱۳۱۲ھ

اس کے بعد یہ مثنوی متعدد بار[1] شائع ہوئی ہے مثنوی کے آخر میں محمد ممتاز علی خاں ممتاز شاگرد داغ کی تقریظ ہے وہ لکھتے ہیں:

"مثنوی کہی تو ایسی سبحان اللہ جس نے سنا انھیں کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ان کے کلام کو سحر سامری کہو تو بے ادبی ہے اس لیے سحر حلال کہتا ہوں......اُن کا ہر شعر معشوق طناز ہے بندشیں ایسی چلبلی کہ کلیجے میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ محاورے روزمرہ سے ایسے صاف کہ دل کھینچے لیتے ہیں۔ انوکھی گھڑت نرالی ترکیب ہے۔ یہ بندش یہ تلاش کس کے نصیب ہے۔ اس زمانہ میں تفنن طبع کے لیے احباب کی خاطر سے ایک مثنوی ارشاد فرمائی ہے۔ مثنوی کیا ہے ارباب شوق کا مدعا ہے۔ اصحاب ذوق کا التجا ہے۔ آج تک کسی نے یہ رنگ دیکھا نہ یہ ترکیبیں سنیں"[2]

مثنوی فریاد داغ جس وقت لکھی گئی اُس وقت داغ کی عمر ۵۴ سال کی تھی۔ اس عمر میں اُن کے معاشقے کی اس سچی تصویر سے اُن کی رندی اور شاہد پرستی کا اندازہ ہوتا

---

۱ تمکین کاظمی نے ۱۹۵۶ میں معمقدمہ کے کمرشل بکڈپو چار مینار حیدر آباد دکن سے شائع کرائی ہے۔

۲ فریاد داغ ص: ۵۵

ہے جب اس عمر میں عشق وہوس کا جذبہ اتنا شدید تھا تو نوجوانی میں کیا عالم رہا ہوگا۔اس مثنوی میں کل ۸۳۸اشعار ہیں۔

حمد،نعت،منقبت اور نواب کلب علی خاں کی تعریف میں چند اشعار کے بعد عشق کی تعریف بیان کی ہے اس میں داغ نے عشق کا کوئی بلند نظریہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ عشق کو لطفِ زیست کا ذریعہ بتایا ہے۔

عشق کا لطف زندگانی ہے　　زندگی کا مزا جوانی ہے

داغ نے دل کھول کر عشق کیا تھا۔انھوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنے ہرجائی پن کا ذکر کیا ہے۔

دل ستایا ہوا ہزاروں کا　　داغ کھایا ہوا ہزاروں کا

لیکن مدتوں خونِ دل پینے کے بعد انھوں نے پارسائی اختیار کر لی تھی کہ دل لگانے کے ولولے کروٹیں لینے لگے۔امنگیں جوان ہونے لگیں اور اس کا موقع بھی جلد ہی مل گیا۔ایک حور طلعت پری شمائل،آفت جان منی بائی حجاب سے بے نظیر کے میلے میں آمنا سامنا ہوتے ہی دل ہاتھوں سے جاتا رہا۔تماشا دیکھنے گئے تھے اور خود تماشا بن گئے۔

عشق نے تازہ روپ بدلا تھا　　میں بھی میلے[1] میں اک تماشا تھا

صفت معشوق کے عنوان سے داغ نے حجاب کا جو سراپا بیان کیا ہے اس میں کچھ کھلے ڈلے شعر بھی ہیں ملاحظہ کیجئے۔

جٹی جٹی بھووں کی وہ تحریر　　کیوں نہ دل اس لکیر کا ہو فقیر

چشم خوں ریز وہ فساد انگیز　　جس کا شاگرد فتنۂ چنگیز

---

[1] فریاد داغ از تمکین کاظمی ص: ۷تا ۱۳۔

گردن اس کی ہے وہ صراحی دار ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار
ایسے پتھر وہ دونوں قبۂ نور شیشہ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام فتنہ قد، فتنہ چشم، فتنہ خرام
نگہ مست ہوشیاری سے لڑانے والی چھری کٹاری سے

مختصر یہ کہ

اُف رے عہد شباب کی مستی بے پئے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ ہائے تیرا خرام مستانہ

ابتدائی ملاقات کے بعد اور مراحل داغ جیسے آزمودہ کار کے لیے زیادہ دشوار نہیں تھی اور وہ بہت جلد کامران و بامراد ہو گئے۔

ایک اک دم میں سو مدارا تیں لطف کی دن وہ عیش کی راتیں
رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا ہوتی رہتی کھلی ڈلی کیا کیا
خانہ دوست عیش خانہ تھا ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

لیکن

عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا چار دن شادماں نہ دیکھ سکا

اور اس کے بعد ہجر کی گھڑی آ گئی۔ داغ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ محبوب نے وطن جانے کا قصد کر لیا، رخصت ہوتے وقت عہد و پیمان ہوئے راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ کہا سنا بخشوایا گیا۔ حجاب نے کلکتہ کی تعریف کی۔

ہے حکومت کی شان کلکتہ سلطنت کا نشان کلکتہ
انتخاب زمان کلکتہ فخرِ ہندوستان کلکتہ

اور داغ کو اس طرح تسلی دی۔

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں   مر نہ جانا مری جدائی میں
زندگی شرط ہے تو آئیں گے   لطف صحبت کے پھر اٹھائیں گے

اور آخر کار داغ نے حجاب کو اس طرح رخصت کیا۔

ساتھ اُس کے مری نگاہ گئی   جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

رخصتی کا اس سے بہتر موقع پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد داغ نے ''بیانِ حالتِ ہجرانِ ناہنجار و گلہ فلکِ کج رفتار، کے عنوان سے درد فراق کی کیفیت اور رنج والم کی حالت بیان کی ہے۔ لیکن چونکہ داغ کا پختہ کاری کا عشق تھا اس لیے اس کے بیان میں تصنّع پایا جاتا ہے۔

تپ دوری نچوڑتی ہے مجھے   دم بدم روح چھوڑتی ہے مجھے
دل کی حالت بری ہے سینے میں   سانس چلتی چھری ہے سینے میں
دل سے پہروں کلام کرتا ہوں   زندگی کو سلام کرتا ہوں
الفراق الفراق وردِ زباں   الاماں الاماں یہ شورِ فغاں

اِسی جنونِ عشق میں ہر ایک سے محبوب کا اور اغیار کا حال پوچھتے تھے۔ اسی عرصے میں نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا اور داغ نے حجاب کو بے نظیر کے میلے میں شرکت کی دعوت دی۔ اس کا جواب حجاب نے داغ کو یہ بھیجا کہ اگر کوئی بلانے والا اور جلسہ دکھانے والا ہو تو وہ میلے میں آنے کو تیار ہے۔ حجاب آنا چاہتی تھی لیکن درمیان میں نواب کلب علی خاں کے برادر خورد حیدر علی خاں حائل تھے اور اس کے آنے کی صرف یہی صورت تھی وہ طلب کریں چنانچہ داغ نے یہ بھی گوارا کیا۔

میں نے سوچا یہ امر اولیٰ ہے   وہ بلائیں جنھوں نے روکا ہے
اُن کی کس کس طرح اطاعت کی   پھر انھوں نے بھی یہ عنایت کی

صاف دل سے مراسلہ بھیجا　　　کہ بنارس انھیں بلا بھیجا

بنارس سے رام پور زیادہ دور نہیں تھا۔ حجاب کی آمد پر گویا خزاں رسیدہ باغ میں بہار آگئی۔ عہد شباب لوٹ آیا۔

جا کے عہدِ شباب کا آنا　　　تھا دو بار حجاب کا آنا
تھا یہ اس گلعذار کا آنا　　　یا نسیمِ بہار کا آنا
پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　　کہ برس دن کے بعد عید آئی
میرے غم خوار جاکے لائے انھیں　　　نہ بنی کچھ بغیر آئے انھیں
آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ　　　ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ

اس حجاب واحتراز کی وجہ رقیب تھا۔ داغ نے ہر چند سمجھایا اور اپنی طلبِ صادق کا یقین دلایا لیکن حجاب پر اثر نہ ہوا۔ ناچار داغ کو یہ کہہ کر صبر کرنا پڑا۔

صبر میں نے کیا برس دن تک　　　کیا قیامت ہے اور دس دن تک

داغ تجربہ کار اور پختہ کار تھے وہ جانتے تھے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی چنانچہ وہی ہوا جس کی داغ کو توقع تھی۔

چار دن میں یہ اتفاق کی بات　　　اُن سے ایسی ہوئی نفاق کی بات

اب داغ کے لیے میدان صاف تھا۔ عیش وعشرت کا دور دورہ تھا۔

پھر تو وہ ٹوٹ کر ادھر آئے　　　دام سے چھوٹ کر ادھر آئے
گذری اوقات عیش وعشرت سے　　　دو مہینے تک ایک صورت سے
دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے　　　میرے کہنے کو دل میں مان گئے

لیکن حجاب اپنے پیشے اور تربیت کی مناسبت سے زیادہ عرصے تک کسی ایک کی پابند ہوکر نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ اس مختصر عرصے میں ہی اس کی طبیعت اکتا گئی اور قفس

سے آزاد ہونے کے لیے پھڑ پھڑانے لگی۔

بولی میری بلا قفس میں رہے　　آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رام پور مجھے　　جلد رخصت کریں حضور مجھے

اور داغ کو بادلِ ناخواستہ رخصت کرنا پڑا۔ چلتے وقت حجاب نے اُن کو تسلی بھی دی اور کلکتے آنے کا وعدہ بھی لیا۔ قول و قرار بھی ہوئے اور زمانے کے نشیب و فراز بھی سمجھائے گئے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ کلکتہ میں بھی داغ کے کچھ بدخواہ رقیب پیدا ہو گئے اور انھوں نے حجاب کو داغ کے خلاف ورغلانا شروع کیا۔ اور داغ کی محبت کو آزمانے پر آمادہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ حجاب نے بتا کید داغ کو کلکتے طلب کیا۔ حجاب کے بلانے کا انداز دیکھئے۔

رسم الفت بناتے ہو اگر　　جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اُٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ　　کوئی روکے کے مگر چلے آؤ

یہ طلبی ایسی تھی کہ باوجود مجھ کو مرنے کی بھی فرصت نہیں، کے داغ کوئی عذر نہ کر سکتے اور جواب میں لکھتے ہی بن پڑا کہ تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن، بہرحال داغ نواب کلب علی خاں سے رخصت لے کر رام پور سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر کی تفصیل داغ نے خود لکھی ہے۔ غرض دلی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد اور عظیم آباد ہوتے ہوئے منزل مقصود پر جا پہنچے۔

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا　　داغ آیا تو باغ باغ آیا

کلکتہ میں ناخدا کی مسجد کے سامنے بالائے بام قیام کیا۔ یہاں بخت ساز گار اور یار دمساز تھا اس لیے داغ نے دل کھول کر دادِ عیش دی۔ ہر روز روزِ عید تھا ہر شب شب برات تھی۔ اس کی کیفیت داغ کی زبان سے سنئے۔

بخت بیدار و یار ہے دمساز اے شبِ وصل تیری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف صبح سے شام تک وصال کے لطف
غم کی راتیں نہ تھے ملال کے دن کیا پھرے تھے شبِ وصال کے دن
عیش وعشرت کی بات بات اچھی رات سے دن تو دن سے رات اچھی
مسکراتے تھے لب جو دلبر کے کھلے جاتے تھے پھول بستر کے
ہر گھڑی نوک جھونک ہوتی تھی دمبدم روک ٹوک ہوتی تھی
چاندنی کے تمام شب جلسے دلکشا سقف پر عجب جلوے
یاد ہے اک رشکِ گل کی سیر چودھویں رات کو وہ پُل کی سیر
رات عیش و نشاط میں گزری صبح تک اختلاط میں گزری
مدعی لاکھ ڈر دکھاتے ہیں وہ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں

عیش وعشرت کا یہ زمانہ بھی دیر پا نہیں نکلا۔ داغ کی رخصت کی مدت ختم ہوگئی اور رام پور سے طلبی کا پیام آ گیا۔

جلد حاضر ہو یہ پیام آیا اور سر پر مہ صیام آیا

ادھر محبوب کا روکنے پر اصرار اور دلبر کی جدائی کے خیال سے دل فگار اُدھر آقائے نامدار کا پاسِ نمک خواری سخت کشمکش تھی آخر کار حق نمک خواری غالب آیا اور بصد حسرت و یاس داغ رام پور کے لیے روانہ ہو گئے۔

مضطرب ہو کے ہم ٹھہر نہ سکے ایسے مجبور تھے کہ مر نہ سکے
اہلِ صحبت کو داغ دیکے چلے اپنے دل کا جنازہ لیکے چلے

دو دن میں ریل کے ذریعے سفر طے کر کے رمضان سے ایک دن پہلے رام پور پہنچ گئے۔ اس کے بعد مثنوی کے خاتمے تک دردِ فراق، صدمۂ ہجراں اور طعنۂ اغیار کا

بیان ہے۔ یہاں تک کہ اس دُعا پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے ۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے   وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اُس کا خیال بھی نہ رہے   اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

اس مثنوی میں نہ منظر نگاری ہے نہ کردار نگاری ہے اور نہ محاکات ہیں نہ کسی مکمل اور معیاری داستانِ عشق کو نظم کیا ہے بلکہ ذاتی اور وارداتی قسم کی ہے۔ ایک نجی سرگزشت کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ مثنوی کسی خاص وقت کے سماج کی کیفیت کو بھی ظاہر نہیں کرتی نہ اس وقت کے معاشرے اور تمدنی حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ نہ اس کا تخاطب عام و خاص سے ہے۔ بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ایک وقتی جذبے کو بیان کر کے دل کا بخار نکالا ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے۔ اس میں ایک رند شاہد باز اہلِ نشاط سے تعلق رکھنے والا عورت کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اور اپنی محبت کو علی الاعلان جنسی کشش کی ایک شکل بتاتا ہے۔ عورت بھی داغ کی شاعری، نام آوری اور شہرت پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ داغ نہ تو خوش رو تھے اور نہ اُس وقت نوجوان تھے۔ دونوں میں کس قسم کی محبت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب داغ کی طلبیہائے بسیار“ کے بعد حجاب دوبارہ رام پور آئی تو اُن کے رقیب کے پاس فروکش ہوئی۔ داغ نے محبت میں اپنی وضع داری کا واسطے دے کر اور غیر کی چار دن بعد تغافل شعاری کا خوف دلا کر اُسے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن حجاب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ داغ اپنی اور رقیب کی محبت کا تقابل اس طرح کرتے ہیں ۔

وضع نبھتی ہے وضعداروں سے   یا اطاعت کے خواستگاروں سے
وہ کہیں پاسِ وضع کرتے ہیں   جو یہ جانیں یہ ہم پہ مرتے ہیں
طور سب غیر غیر دیکھو گے   چار دن بعد سیر دیکھو گے
میرے کہنے کی داد دو گے تم   نام اُن کا کبھی نہ لو گے تم
صبر میں نے کیا برس دن تک   کیا قیامت ہے اور دس دن تک

اس کی تشریح اُن کے خطوط سے جو اُن دنوں میں منی بائی حجاب کو لکھے ہیں بخوبی ہوتی ہے اپنے پہلے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں۔

''ستم گرو ستم پیشہ، شوقِ ملاقات کے بعد مدعا نگار ہوں کہ تم دو روز سے نواب صاحب[1] کے یہاں تھیں۔ یہاں دل پر عجیب عالم گزر گیا۔ میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہوگئیں۔ اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں۔ جن سے واسطہ ہے اور جن سے وفاداری کا عہد کر چکی ہیں اپنے قول پر قائم ہیں۔ ایک طرف دولت ہے ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے۔ تمہارا دل دادہ اُن کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا مگر تمہاری الفت میں جان سے ضرور گزر سکتا ہے کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ تم کو یقین ہے اور جب نہیں کر سکتے تو پھر کس لیے تم داغ سے پرستار کو محو کیے ہو؟ دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر قطعی ترکِ تعلق منظور و پسند نہیں تو پھر

---

[1] نواب حیدر علی خاں جو داغ کے رقیب تھے اور بہت بڑے زمیندار تھے۔

مجھے دید وشنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو مجکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حجاب پر داغ کے اس مکتوب کا کوئی اثر نہ ہوا یہاں تک کہ مندرجہ بالا شعر میں داغ نے جو باہمی سمجھوتہ پیش کیا تھا یعنی اُن سے اور رقیب سے دونوں سے رسم وراہ رہے حجاب اس پر بھی تیار نہ ہوئی۔ آخر کار داغ نے آتشِ رقابت سے جل کر انتہائی ناراضگی میں حسبِ ذیل مکتوب بھیجا:

بے مہر و بے وفا!

کل اس محفل سے بادلِ داغدار اور یاس و حرماں کا گہرا چرکا کھا کر آیا ہوں۔ اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ تماشا کب تک۔ معاملہ یکسو ہونا ضروری ہے...... کب تک مطاعین جگر دوز سنو۔ کلیجے میں ناسور پڑ گئے ہیں اب تو ان کا علاج کرنا ہی ہوگا کہیے آپ کے دل کی ہوس گھٹی یا بڑھی۔ وہ آدمی ضرور بے حس ہے اور اس کے سینے میں بجائے دل کے فولاد کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ جو یہ منظر دیکھے اور چپ رہے۔ بیشک تم نے حرملہ اور ابن سعد کے گلے میں بانہیں ڈالیں تم بیشک خولی اور ابنِ نمیر کی گود میں بیٹھیں اوتم یقیناً یزید کی معشوقہ بنیں۔ میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے۔ تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ سب شکرے ملک کرنو چا کھسوٹا کریں۔ آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے کون جانے اس کا کیا انجام ہو یہی لیل و نہار ہیں تو داغ کا سلام قبول ہو۔ دل

---

[1] زبان داغ ص:۱۸۳ (یہ شعر غالب کا ہے)

پر جبر کی سل رکھوں گا مگر تمہارا نام نہ لوں گا۔ آخر بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔[1] داغ دہلوی

تعجب کہ داغ بے حیائی کا یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی حجاب سے دست بردار نہیں ہوئے بلکہ چند دن بعد جب نواب صاحب سے نفاق ہوگیا اور حجاب اُن کے پاس چلی آئی تو انھوں نے بڑی کشادہ پیشانی سے اُسے گلے لگالیا اور فخریہ انداز میں کہتے ہیں۔

پھر تو وہ ٹوٹ کر ادھر آئے دام سے چھوٹ کر ادھر آئے

ان تمام خامیوں کے باوجود اس میں کچھ قابلِ قدر محاسن بھی ہیں۔ داغ نے واقعات کے ثبوت میں کسی مافوق العادت قوت سے کام نہیں لیا ہے۔ بیان کا تسلسل قابلِ تعریف ہے ایک معمولی واقعے کو اس دلکشی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے گئے ہیں۔ اس کی زبان نہایت سلیس اور فصیح ہے۔ اس میں فارسی ترکیبیں اور ثقیل الفاظ مطلق استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ برجستگی، بے ساختگی اور سادگی نے مکالمہ کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اگر چہ یہ مثنوی اعلیٰ ادبی مثنویوں مثلاً سحر البیان، زہر عشق، گلزار نسیم وغیرہ کے پایے کی نہیں ہے لیکن سادگی، صفائی، اصلیت و واقعیت، جذبات نگاری اور سراپا نگاری میں کسی مثنوی سے کم درجہ نہیں ہے۔ اس مثنوی میں داغ کا یہ کمال بھی نمایاں ہے کہ اس پر کہیں پست نگاری، فحش نگاری اور ابتذال کا الزام عائد نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر چہ رام بابو سکسینہ کا خیال ہے:

''اس مثنوی کے بہت سے اشعار اعلیٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور

1۔ زبان داغ ص: ۱۸۵

روانی وعمدگی ان کی قابلِ داد ہے۔علی الخصوص عاشق کا معشوق کی
تصویر سے تخاطب نہایت، دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔مگر
بعض جگہ تعیش اورخراب جذبات کی تصویریں متانت اورتہذیب
سے گری ہوئی ہیں"۔[1]

غالباً داغؔ کی شوخ نگاری رام بابوسکسینہ کے معیارِ متانت اور تہذیب پر پوری نہیں
اتری اس لیے انھوں نے یہ اعتراض کیا۔اگر چہ یہی معیار مقرر کیا جائے تو مثنوی
سحرالبیان جواردو کی بہترین مثنوی مانی جاتی ہے اس الزام سے مبرا نظر نہیں آتی۔
کیونکہ سراپا کے اور عاشق ومعشوق کی ملاقات کے بیان میں میرحسن بھی پھسل گئے
ہیں۔اول الذکر کے بیان میں بعض اشعار میں اعضا کی بہت کھلی تشریح کی گئی
ہےاورمؤخرالذکر کے بیان میں دوایک شوخ اشعار میرحسن کی قلم سے ٹپک پڑے
ہیں۔ملاحظہ کیجیے سراپا کے بیان میں کہتے ہیں۔

ز بس مثل آئینہ تھا اس کا تن — کہے تو کہ تھی ناف عکس ذقن
وہ زانو کہ آجائے گر اُس پہ ہاتھ — رہے عمر بھی ہاتھ زانو کے ساتھ
جو دیکھے وہ انگیا جواہر نگار — فرشتہ ملے ہاتھ ہاتھ بے اختیار
نکیلی وہ اُٹھتی ہوئی چھاتیاں — پھریں اپنے جوبن پہ اِنڈ لاتیاں

وصل کے بیان میں لکھتے ہیں۔

لگی ہونے بے پردہ جو چھڑ چھاڑ — در حسن کے کھل گئے دو کواڑ
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن — دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
غم دور و دامن کشیدہ ہوئے — وہ گل نا رسیدہ رسیدہ ہوئے

---

[1] تاریخ اردو ادب مؤلفہ رام بابوسکسینہ مترجم مرزامحمد عسکری ص:۳۷۰

ان اشعار میں کچھ عریانیت ضرور آگئی ہے لیکن انھیں فحش ومبتذل نہیں کہا جاسکتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

لیکن ان پر بھی پست مذاقی، فحش نگاری یا ابتذال کا لیبل لگانا مشکل ہے کیونکہ ان میں بھی مناظر اور جذبات صرف اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوئے ہیں۔"[1]

فریادِ داغ میں اس قدر عریانیت بھی نہیں ہے ایسے مواقع پر داغ نے اشاروں اور کنایوں سے کام لے کر بڑی چابک دستی سے اپنا دامن فحاشی اور ابتذال سے بچایا ہے اور متانت اور تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وصل کے بیان میں وہ "ہوئی رہتی کھلی ڈلی کیا کیا" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مذکورہ بالا اقتباس سے آگے تحریر کرتے ہیں:

"داغ نے وصل کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے۔ عیش وعشرت کا جابجا تذکرہ ہے لیکن معاملات درونِ پردہ کی تشریح یا تفصیل کہیں بیان نہیں کی ہے اور جو کچھ کہا بھی ہے اُسے اشاروں اور کنایوں میں ادا کیا ہے۔ شعر کا حسن اگر حسنِ معنی اور حسنِ بیان کا مجموعہ ہے تو اس مثنوی کا بیشتر حصّہ حسین قرار پاتا ہے۔ اس میں اصلیت اور واقعیت ہے۔ جذبات نگاری اور سراپا نگاری ہے ہجر ووصل کے عالم کا بیان ہے اور ہر جگہ بات صفائی اور سادگی سے بیان کی ہے۔"[2]

---

[1] نگار داغ نمبر (داغ کی عشقیہ شاعری میں رندی ور شاہد پرستی) ص:۱۰۷

[2] غزل اور متغزلین　ص:۱۹۱

غرض یہ کہ یہ مثنوی داغ کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔حجاب کا پیکر وہی ابھرتا ہے کہ جو ایک طوائف کا کردار ہونا چاہئے۔قصے کی سادگی سے پرلطف انداز میں کیا ہے ہر شعر حشر جذبات اور وارداتِ قلبی کا نچوڑ ہے۔اس میں ادبی و معنوی محاسن بھی کافی ہیں۔اس مثنوی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر داغ اس صنف کی طرف توجہ دیتے تو وہ اور بھی کامیاب مثنویاں لکھ سکتے تھے۔

باب سوئم

مکتوباتِ داغ بنام منی بائی حجاب

تعارف

رفیق مارہروی
ابنِ احسن مارہروی

منی بائی کلکتہ کی رہنے والی تھیں ان کے حالات و واقعات اختصار کے ساتھ شاعرات نے مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ وہ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت بھی رکھتی تھیں۔ شاعری بھی کرتی تھیں[1]۔ حجاب تخلص تھا، نواب کلب علی خاں نے رام پور میں سال ۱۸۶۵ء میں ''میلۂ بے نظیر'' لگوایا تو یہ کلکتہ سے رام پور تشریف لائیں اور فصیح الملک داغ دہلوی سے ملاقات ہوئی نہ معلوم کیا ادا بھائی کہ داغ دل دے بیٹھے، کچھ عرصے رام پور رہ کر داد حسن پا کر واپس کلکتہ ہوئیں۔ ۱۸۸۱ء میں دوبارہ میلہ بے نظیر میں شرکت کی، داغ صاحب سے محبت کے اور پینگ بڑھے لیکن اس دفعہ حجاب کے کچھ اور ایسے قدر دان پیدا ہو گئے کہ

---

[1] ان کے کچھ اشعار فرمایئے۔

امر دشوار تھا اس گھر میں رسائی میری — کشش دل نے پتہ ٹھیک بتایا تیرا
آج وہ مجھ سے سر بزم ادا سے بولے — تو شناسا ہے مرا میں ہوں شناسا تیرا

بزم دل دار میں اغیار کا مجمع ہے حجاب
قصد کیا دل میں ہے اب کیا ہے ارادہ تیرا

بس میں اغیار کے ہے یار اپنا — دل ہے اس غم سے بے قرار اپنا
دل بہت بے چین بے آرام ہے — کیا محبت کا یہی انجام ہے

حضرتِ داغ کو رقیب کی رقابت سے بھی واسطہ[1] پڑا منت دربان بھی کرنا پڑی، احباب کے طعنے اور محبوب کے ستم و جور بھی برداشت کرنا پڑے۔ حجاب کچھ عرصے رام پور رہ کر کلکتہ واپس گئیں لیکن اس دفعہ وہ داغ کے دل و دماغ کو کچھ اتنا متاثر کر کے گئیں کہ ان کی زندگی بدمزہ گزرنے لگی۔ مثنوی فریادِ داغ اسی عشق و محبت کا نتیجہ ہے۔ حالات جب ناقابل برداشت ہو گئے تو ۱۸۸۲ء میں حجاب سے ملاقات کرنے کلکتے گئے اور کچھ روز وہاں رہ کر دادِ عیش لے کر واپس ہوئے اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے یہ محبت سرد پڑ گئی اور گاہے گاہے خط و کتابت پر محدود ہو گئی۔ ۱۹۰۱ء میں حجاب حیدر آباد تشریف لائیں اور دو تین سال رہیں، داغ کا یہ آخر زمانہ تھا۔ عمر کے ساتھ جذبات بھی سرد ہو چکے تھے، حسن پرستی فطرت ثانیہ تھی لہٰذا اس آخر زمانے میں ارباب نشاط کی وابستگی بجز وضعداری ہی کے اور کچھ نہ تھی۔ بعض حالات کی بناء پر اس وضعداری میں بھی فرق آیا اور حجاب سے تعلقات خراب ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۴ء میں بی حجاب کلکتہ واپس چلی گئیں۔ داغ صاحب

---

[1] جلوۂ داغ صفحات ۳۴۔۳۵۔۲۷ تا ۳۲

ا۔ اس سلسلہ میں داغ کی وہ زندگی جو رام پور وغیرہ میں گزری ہمارے سامنے نہیں ہے اور حقیقت میں حیدر آباد کی ملازمت سے پہلے وہ مالی اعتبار سے اتنے مطمئن بھی نہ تھے بہر حال دوران قیام حیدر آباد میں سب سے پہلے انھوں نے صاحب جان طوائف کو ملازم رکھا۔ آگرہ کی رہنے والی تھی صورت و شکل میں تو اچھی نہ تھی لیکن گانے میں طاق تھی اور بڑا اونچا کلام اسے یاد تھا اس کے بعد عمدہ جان کو جو میرٹھ کی رہنے والی تھی ملازم رکھا۔ بڑی حاضر جواب اور حسین و جمیل تھی کسی کے گھر پڑ گئی آخر زمانہ میں سورت کی اختر جان کو ملازم رکھا جو نو عمر اور مہ جبین تھی، داغ صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا علاوہ دو تین مستقل ملازموں کے مہینے میں دو تین بار باہر کے گانے والوں سے بھی دل بہلایا کرتے تھے علاوہ طوائفوں کے دو ایک گویئے بھی ملازم تھے چنانچہ رحمت اللہ قوال مستقل ملازم رہتا تھا۔

کے دامنِ عشق و محبت سے تمام ارباب نشاط لگے لپٹے[۲] رہے۔ لیکن حجاب کا ان میں خاص درجہ تھا اور داغ کے دل و دماغ پر پوری طرح چھائی ہوئی تھیں جس کا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکیں گے جو یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)

دشمن جانی سلام شوق عین انتظار میں تمہارا محبت نامہ دستیاب ہوا، کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا رہا۔ تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کرلو گے جب ہی تمہارے پاس آؤں گی خوب تم کو بھول جاؤں۔

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
ناداں[۱] کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے لکھو کہ کب آرہی ہو۔

فصیح الملک داغ دہلوی حیدرآباد، ۲۰ مارچ ۱۹۰۲ء

(۲)

ستم گر و ستم پیشہ۔ شوق ملاقات کے بعد مدعا نگار کہ تم دو روز سے نواب[۲]

۱۔ مولوی سید افتخار عالم صاحب اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ دوسرے دن فرمائش پر میری حضرت داغ نے اس زمین میں غزل فرمائی اور اس شعر کو ذرا سی ترمیم کے بعد مقطع کر لیا۔

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

۲۔ نواب حیدر علی خاں جو رامپور سے ضلع بدایوں میں منتقل ہوگئے تھے اور قصبہ ملبسی میں رہنے گئے تھے اور بہت بڑی زمینداری خرید لی تھی۔

صاحب کے یہاں تھیں۔ یہاں دل پر عجیب عالم گذر گیا میں نہیں مانوں گا کہ تم مجبور ہوگئیں۔ اس ریاست میں ایسی بھی خدا کی بندیاں موجود ہیں کہ رئیس کے ہزار دباؤ پر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتیں۔ جن سے واسطہ ہے اور جن سے وفاداری کا عہد کر چکی ہیں، اپنے قول پر قائم ہیں۔ ایک طرف دولت ہے ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے، تمہارا دل وادہ ان کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا مگر تمہاری الفت میں جان سے ضرور گزر سکتا ہے کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں تم کہ یقین ہے اور جب نہیں کر سکتے تو پھر کس لیے تم داغ سے پرستار کو محو کئے ہوئے ہو۔ دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر قطعی ترک تعلق منظور و پسند نہیں تو پھر مجھے دید و شنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

یہ رقعہ تمھیں جلانے کو نہیں لکھا ہے نہ اس کا مطلب طعن و تشنیع ہے، مدعا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور میری کچھ دل داری فرمائیں۔

بدنصیب داغ دہلوی

(۳)

بائی جی! سلام شوق

غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، کبھی تمہارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالا بن جاتا، کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور تپنگا بن کر قربان ہو جاتا کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا، ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے

انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی ہے کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا، خدا کے واسطے جلد آ دیا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو، شب و روز انتظار گزرتے ہیں، وہاں کے لوگ کیوں کر خوشی سے اجازت دیں گے، تم ہی چاہوگی تو روانگی ہو سکے گی، میں تمہارے لیے بلبلا رہا ہوں، یہ خوفناک کالی کالی راتیں اور تنہائی کیا کہوں کیوں کر تڑپ تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں، یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں۔ میرے دونوں خطوں کے جواب آنا ضرور ہیں۔ فقط

تمہارا دلدادہ منتظر

''داغ''

۵ ستمبر ۱۸۸۰ء

(۴)

بے مہر و بے وفا!

کل اس محفل سے بادل داغدار اور یاس و حرماں کا گہرا چرکا کھا کر آیا ہوں، اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ تماشا کب تک، معاملہ یک سو ہونا ضروری ہے۔ صبح و شام ہوتے ہوتے اتنا زمانہ تو گزر گیا آخر کوئی حد بھی ہے، کب تک مطاعین جگر دوز سنوں، کلیجے میں ناسور پڑ گئے ہیں اب تو اس کا علاج کرنا ہی ہوگا۔ کہیئے آپ کے دل کی ہوس گھٹی یا بڑھی، وہ آدمی ضرور بے حس ہے اور اس کے سینے میں بجائے دل کے فولاد کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے جو یہ منظر دیکھے اور چپ رہے، بے شک تم نے حرملہ اور ابن سعد کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ تم بے شک خولی اور ابن نمیر کی گود میں بیٹھیں ہو تم یقیناً یزید کی معشوق بنیں۔ میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے، تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شکرے مل کر

نو چا کھسوٹا کریں، آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے کون جانے اس کا انجام ہو۔ یہی لیل و نہار ہیں تو داغ کا سلام قبول ہو، دل پر جبر کی سل رکھوں گا مگر تمہارا نام نہ لوں گا۔ آخر بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ ''داغ دہلوی''

(۵)

دل دار و دل نواز!

کیا غضب ہے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی تمہاری نگاہیں پھر گئیں۔ وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کر دئے۔ خط روانہ کیا تھا وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال، کیا میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں، کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا، کیا تلملانا میں نہیں جانتا، اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا، تم سے وعدہ لیا تھا اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا آج دس دن ہو گئے نہ خیر ہے نہ خبر اور کچھ اگر نہ لکھتیں تو خریت سے ہی اطلاع دے دیتیں، یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے، کوئی بات اچھی نہیں لگتی، جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے۔

تمہارا
داغ دہلوی
۳۰ ستمبر ۱۸۷۹ء

(۶)

لو مبارک ہو، واہ میں بھی کیا خود غرض ہوں اپنا مطلب نکلے اور دوسروں کو مبارک بادی، جی چاہتا تھا نہ لکھوں کہ سناٹا گذر جائے گا، خدا جانے کون کون

اس رشک سے مرجائے گا مگر کیا کروں بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی، وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی الحمدللہ کہ اب بر آئی، بگاڑ کر جانا تمہارے پاس دشوار نہ تھا مگر نہ یہ میری آدمیت نہ تمہاری اجازت، حضور پرنور دام اقبالہ نے جان لیا کہ اس کی جان مفت میں جاتی رہے گی پرسوں بطیب خاطر فرمایا کہ تم جلد کلکتے چلے جاؤ۔ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے۔ وہاں جا کر دو تین ہفتے میں آسکتے ہو، عدم کو جاؤ گے تو کہاں پاؤں گے، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے بسر و چشم منظور کیا۔

(۷)

جناب من

جو منشاء ہے وہ نواب صاحب کی زبانی کہلوا چکا ہوں، اس سے زیادہ کی مجھ سے امید نہ رکھو۔ مکان کا کرایہ میرے ذمے، تمہارے ملبوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمہ، تو پھر سو روپیہ تمہارے لیے کیوں کافی نہیں ہیں۔ ادھر ادھر سے قرض لینا اچھا نہیں۔ خود ذلیل اور میں مطعون ہوتا ہوں، ان لوگوں سے جو تمہارے سر ہیں کہو کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں، دوسروں پر بار بننا کسی طرح مناسب نہیں۔

خدا بخش تاریخ درود سے بے تعلق ہے، اس کو میرے متعلق سمجھو، اس کی آمد و رفت تمہارے یہاں میری منشاء پر ہے ورنہ وہ خود تم سے شاکی ہے اور ذرا بھی تمہارا روادار نہیں۔ یہ چلن محاسبہ دل میں کرو کیا گنجائش دلوں میں پیدا کر سکتے ہیں، نواب صاحب آئیں تو بھیجوں، تمہاری باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔ یکایک جو تغیر ہو گیا ہے، اس کی وجہ خدا کے سوا کسے معلوم ہو سکتی ہے۔

نواب صاحب سے کل امور پر صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کرو، اگر کلکتے

کی واپسی چاہتی ہو تو کھل کر بتاؤ، مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ ہر چیز تمہاری مرضی پر ہوئی اور اب بھی ہوگی ناراض ہو کر جانا منظور ہے تو کون روک سکتا ہے۔

فصیح الملک داغ دہلوی

(۸)

نیک بخت، پاک دامن، بے لوث منی بائی صاحبہ حجاب، سلامت رہیئے۔ گستاخی معاف گزارش واقعی ہے، نہ شکایت بے جا، کیا خوب مجھ پر ایک آسمانِ حوادث ٹوٹ پڑے، میرے دانت نکل جائیں، آپ دانت نکال کر ہنسیں۔ سلامتی سے پورا خط دیکھنے کی ضرورت نہیں، اگر دیکھا تو سمجھے کون غرض کسی کو توجہ کیسی کوئی کل کا مرتا آج مر جائے تو گھی کے چراغ جلیں، پہلے خط میں لکھ دیا ہے کہ صاحب سب قسم کے دانت ایک آدمی کے منہ کے لائق بھجوا دیجئے۔ دنیا جانتی ہے کہ بتیس دانت ہوتے ہیں پانچ چار ہی دانت آ جاتے تو میرا کام ہو جاتا، یہ بھی لکھدیا تھا کہ اور احباب کو بھی فرصت ہے اس کی قیمت سے آگاہ فرمائیے بلکہ اب لکھتا ہوں کہ سوداگر کا نام اور نمبر دکان معلوم ہونا چاہئے، کاش یہ لکھدیتیں کہ ہم نہیں سنتے منہ بنواؤ۔

واللہ منی تمہاری کم التفاتی سے مجھے بہت رنج ہوا، آئندہ تکلیف نہ کرنا میں نے تجویز کی ہے کہ میرٹھ میں انگریز کاریگر ہے اس کو بلاؤں تمہارا بہت انتظار کیا جواب دنداں شکن پایا، کس قیامت کی چٹکی لی ہے کہ ہم کو فرصت ہی قلیل تھی اس لیے جواب خط میں تاخیر ہوئی، یہ خط ایسا نہ تھا کہ جس میں غفلت کی جاتی مگر تجاہل کا کیا ٹھکانا اگر اب دانت آئے بھی تو بے کار ہوں گے، عنایت الٰہی سے دانتوں کی تکلیف تو موقوف ہوئی گھٹنے کا درد مارے ڈالتا ہے۔ مجھ کو گمان تھا کہ

چوٹ اُبھر آئی ہے یا اس وقت چوٹ لگی نہیں، یہ بات نہیں، وہاں تو کچھ مادہ معلوم ہوتا ہے۔ پالکی میں جاتا ہوں دوزانوں دربار میں بیٹھا نہیں جاتا۔ حضور فرما دیتے ہیں جس طرح تم سے اچھی طرح بیٹھا جائے بیٹھو، فکر میں ہوں کہ کیا دوا کروں، ایک دوا کی اس سے تخفیف ہوئی مگر درد نہیں گیا۔ اب بہت زیادہ ہے دس دن سولی پر کٹے ہیں۔ حضور پرنور دام اقبالہم کی طبیعت بعارضۂ تپ لرزہ ایسی مبتلا ہوئی کہ صورت ہی دگرگوں ہوگئی تھی۔ خدا نے غریبوں کی طرف دیکھ لیا امراض قدیم نے نچوڑ لیا تھا اس پر یہ آفت آئی۔ آج یہ رئیس چشم و چراغ ہندوستان ہے اور اس پر تمام ہندوستان کا اتفاق ہے۔ آج کل یہاں اس قدر سردی ہے کہ کبھی نہیں دیکھی، رات کو ایک رضائی اور ایک دُلائی کی حاجت ہوتی ہے تمہارے لطف و عتاب کا یہ حال ہے کہ جیسے داستان کے زمرد شاہ کی خدائی، آج جو خالص بندے مقبول کہلاتے ہیں وہ کل مردود ہو جاتے ہیں، میں نے از راہِ جوشِ محبت حکیم صاحب کی مدح میں چند شعر کہے تھے تمہاری ایک تحریر آئی جیسے اس کا جواب۔

مثنوی تمہاری تھی، تمہارے حال کی تھی، تمہارے صفات کی تھی، میں نے تو وہ حال واقعی موزوں کر دیا ہے کیا خبر تھی کہ بی حمیدن نالائق ٹھہرائیں گی اول تو میں نے نہ سمجھا تھا کہ ان کو میرے کلام سے شوق بھی ہے اور مثنویاں صحیح ہو رہی ہیں۔ ان کے حصے کی مثنوی پہلے جائے گی، دس مثنویوں کی بابت پوسٹ ماسٹر جنرل کے ہاں نالش کی گئی ہے میں تو ایک اہل کار ریاست ٹھہرا، ہزاروں تحریریں جاتی ہیں۔ اگر یوں ہی تلف ہوں گی تو کیا ٹھکانا ہے طرفہ تر یہ کہ کہیں سے رسید تک نہیں آتی، معلوم ہوتا ہے یہ فریاد خدا کے گھر پہونچے گی، کاش ایسا ہی ہو۔

تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا داغ ہے چالباز زمانے کا

ظالم ترے دل میں اثر تو کرے، صلہ دلوایئے باتیں نہ بنائے، شیریں جان کے حصّے کی مثنوی حکیم صاحب کو دے دیجئے، مجھ کو کیا غرض ہے کہ شیریں جان کو بطور خود بھیجوں، صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر ہی میں فرخت ہو گئیں۔ مکرّر چھپیں گی، خدا جانے اس مثنوی کا اثر تم نے کیا دیکھا مجھ پر تو چار طرف بوچھار ہے اور اشتیاق ہے جو اس کلام کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ مرزا داغ سلامتی سے سولہ برس کے ہوں گے، مجھ کو برخوردار خدا بخش[1] کے دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے، خدا جانے کیسے ہاتھ پیر نکالے ہیں۔ ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گیا ہوگا۔ میری طرف سے بہت بہت دعا کہنا، اس کی علالت سے میں بہت متفکر ہوتا ہوں، میں نے یہی سنا تھا کہ اس کی شادی کی تجویز ہے، کچھ کیفیت معلوم نہ ہوئی، مالک الدولہ کے انتقال کا سخت ملال ہوا، خدا آمرزش کرے، اہلِ لکھنؤ میں بہت باوضع آدمی تھا، مرتے مرتے مجھ کو مثنوی کی طلب میں خط لکھا تھا ع

ہم رہے جاتے ہیں اور یار چلے جاتے ہیں

حافظ احمد علی خاں شوق صاحب گلدستہ ریاضِ سخن کے ہاں جو مصرع طرح ہوا ہے اس میں ایک مطلع میں نے بھی بکا ہے اس کی داد چاہتا ہوں۔

سب کچھ تو ہو چکا یہ فقط انتظار ہے
کہہ دیں بگڑ کے آپ تجھے اختیار ہے

میرے کہاں نصیب کہ بی حمیدن بائی میرا شکر یہ ادا کریں، جواب خطوں کے قلم انداز ہوئے۔ اس کو تو مدت گزری اُکھڑا اُکھڑا اسلام منشی عبدالحمید لکھ دیتے ہیں وہ اشتراک اسمی کا باعث ہے، شکایت تو مجھ کو ہے، اس خط کے

---

1. وہی خدا بخش حجاب کے برخوردار ہیں جوان کے ہمراہ حیدرآباد آئے تھے۔

جواب میں فرصت قلیل کی شرح لکھ بھیجئے گا، اگر چہ باعثِ رشک ہو، زیادہ خیریت ہے۔

مرسلۂ داغ دہلوی از ریاست مصطفےٰ آباد، رام پور

(۹)

میزبان داغ مہماں سلامت رہو!

پہلے دو خط روانہ کر چکا ہوں، ایک ایک دن ایک ایک مہینہ ہو رہا ہے، اگلے بار جو میں گیا تھا تو کھانا پکانے والے کی طرف سے نہایت تکلیف اٹھائی تھی۔ میرے فرزند مرحوم کی انا جو تمہاری خدمت میں بھی حاضر ہوئی تھی، وہ آج مستدعی ہوئی کہ اپنی روانگی سے پیشتر مجھے وہاں پر بھیج دو میں سب کام کرلوں گی، بائی جی کی خدمت میں رہوں گی کھانا بھی اچھا پکا لیتی ہے، اگر تم مناسب جانو تو میں اس کو پہلے روانہ کردوں۔ بغیر تمہارے وہ نہ رہے گی اور مردانے مکان میں میں نہ رکھوں گا، اس میں جو مناسب جانو وہ مجھے ہدایت کرو، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جس مکان میں پہلے ٹھہرا تھا وہی میرے ہاتھ لگے، میاں عبدالرزاق[1] کو بھی اس باب میں لکھا ہے، دیکھئے کیا جواب آیا ہے۔

مرسلۂ داغ

یکم اکتوبر ۱۸۸۵ء

---

[1] منی بائی حجاب کے حاشیہ نشینوں میں سے تھے کلکتہ ہی میں داغ سے تعلقات ہوئے، شاعری بھی کرتے تھے، شاہ تخلص تھا۔

(۱۰)

منی جان، تمھیں اللہ کی امان!

اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں کہ بخشی عبدالرحیم خاں صاحب میرے پاس اخبار انگریزی لائے، بہت پریشان آئے، میں نے کہا بخشی خیر تو ہے کہا منی بائی کا کچھ حال ہے۔ یہ سنتے ہی ہوش وحواس جاتے رہے، انھوں نے ترجمہ کیا مجھے یقین ہوا کوئی اور منی ہوگی، آب ودانہ حرام ہوگیا، دل کو سمجھا تا ہوں نہیں مانتا، ترجے کو دیکھ کر مفصل جلد لکھو، زیادہ خیریت۔

(۱۱)

مہربان داغ قدردان داغ سلامت رہو۔

جی تو یہی چاہتا تھا کہ دو دن میں اُڑ کر چلا جاؤں مگر طاقتِ سفر ابھی کہاں! گرمی وہ پڑتی ہے کہ الاماں، گل نیلوفر، دھنیا، تخم پالک، خیارین، شربت آلو پینے کو ملتا ہے، حرارت بڑھی ہوئی ہے، مانع سفر ایک اور امر ہوا کہ محرم شریف میں دسہرہ واقع ہوا، ہندو مسلمان میں جھگڑا پھیلا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، اس کا خیال اس کا انتظام ضرور ملحوظ رہے لہٰذا حسب تجویز سرکار عالی وقار چودھویں محرم شریف کو یوم روانگی مقرر رہوا، اللہ راس لائے اور تم سے ملائے، یہ بھی ارشاد ہو کہ بے اطلاع آؤں یا بااطلاع، پہلے در دولت پر سلام کو حاضر ہوں یا اور کہیں ٹھہروں، میاں عبدالرزاق کو مکان کے لیے تاردوں گا اور جو تم کوئی مکان تجویز کر دوگی تو بہت انسب ہوگا۔ مگر جلد اطلاع دو اور جو شئے یہاں کی مطلوب ہو وہ ساتھ لیتا آؤں۔

سب سے ہے تیری آرزو بڑھ کر آرزو سے ہے آبرو بڑھ کر

بہت دل شکستہ اور ارمان بھرا بے سرو پا آتا ہوں، میری لاج تمہارے ہاتھ ہے یا خدا کے ہاتھ، تمہارے گھٹنے کے دردنے اور بے چین کر دیا ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس وقت دربار میں منشی احمد حسن خاں تھے اور میں تھا وہ مجھے بھی چھیڑتے ہیں اور تمھیں بھی چھیڑتے ہیں، مرزا ولایت حسین سلام کہتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں، میر مجاور علی بہت بہت سلام کہتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ میرا ابھی سے جانا وہاں ظاہر ہو اس خط کو پڑھ کر چاک کر ڈالنا، تمہاری وجہ سے وہاں میرے دشمن بہت ہیں، خدا سے تائید اور تمہارا التفات چاہتا ہوں، بہتر تو یہی تھا کہ میں مصارف زادراہ بھجوا دیتا اور تم قدم رنجہ فرمائیں مگر کلکتہ کی قطب بن کر بیٹھ گئی ہو، میں کیا کروں میرا ارادہ جریدہ آنے کا ہے، یہ نہیں معلوم وہاں کس کس چیز کی ضرورت پڑے اگر معلوم ہو تو وہ سامان اپنے ہمراہ لیتا آؤں اگر چہ تمہارا گھر اپنا گھر ہے مگر پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ مبادا تمھیں دقت ہو۔ والسلام

رقیمہ شوق

داغ دہلوی ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء

کتابیات

نمبر شمار	مصنف/مرتب	نام کتاب	سنہ اشاعت	ناشر/مطبع
۱۔	احسن مارہروی	جلوۂ داغ	۱۹۰۲ء	-
۲۔	اسلم پرویز (مرتب)	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ	۱۹۹۹ء	انجمن ترقی اردو پسند (دہلی)
۳۔	تمکین کاظمی	فریادِ داغ معاشقۂ داغ وحجابؔ	۱۹۵۶ء	کمرشل بک ڈپو چارقیار حیدرآباد
۴۔	تنویر احمد علوی	کلیاتِ ذوقؔ	۱۹۸۹ء	ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۵۔	خلیل حسن خلیل	بتخانۂ خلیل مرتب علی احمد جلیلی	۱۹۹۴ء	جلیل منزل سلطان پورہ حیدرآباد
۶۔	رفیق مارہروی	زبانِ داغ		نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنؤ
۷۔	ساحل احمد	اردو خطوط کا مطالعہ	۱۹۹۸	اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد
۸۔	سکسینہ رام بابو	تاریخ ادب اردو	۱۹۸۶ء	مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ
۹۔	شاہد ماہلی	داغ دہلوی	۲۰۰۱ء	غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ نئی دہلی
۱۰۔	علی جواد زیدی	دی ادبی اسکول	۱۹۸۰ء	نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنؤ
۱۱۔	کامل قریشی	داغ دہلوی	۱۹۸۶ء	اردو اکادمی دہلی
۱۲۔	محمد حیدر سید	حیاتِ شوق لکھنوی	۱۹۹۰ء	مصنف لکھنؤ

۱۳۔ محمد عقیل رضوی (سید) اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں ۱۹۸۵ء یوپی اردو اکادمی لکھنو

۱۴۔ محمد عقیل رضوی انتخاب داغ ۱۹۶۰ء ہندوستان اکادمی الہ آباد

۱۵۔ محمد علی زیدی مطالعۂ داغ ۱۹۷۴ء کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ

۱۶۔ محمد فاروق سید مرزا داغ دہلوی کی شاعری ۱۹۹۶ء اردو رائٹرز گلڈ الہ آباد

۱۷۔ ممتاز مرزا بیگم انتخاب داغ ۱۹۹۱ء اردو اکادمی دہلی

۱۸۔ فراق گورکھپوری اندازے ۱۹۵۹ء ہندوستان اکادمی الہ آباد

اشاریہ اشخاص

الف

ب

ت

ج

ح

فرہنگِ فریادداغ

الف

آبِ حیات : امرت، وہ پانی جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کے پینے سے انسان امر ہوجاتا ہے، اور اُسے موت نہیں آتی، یہ بات چشمۂ ظلمات میں ہے۔ سکندر ذوالقرنین اس کی تلاش میں گیا تھا مگر محروم رہا اور حضرت خضر اور حضرت الیاس نے اسے پی کر عمرِ ابد پالی

آبرودار : ذی عزت، مرتبے والا، حیادار، غیرت دار

آتش تر : شراب

آتشِ دوزخ پہ ہوگا آتشِ تر کا گماں
گر کسی میکش نے اپنا دامنِ تر رکھدیا داغ

آرام پور : آرام کی جگہ، آرام بستی

آشام : پینے والا یہ عموماً مرکبات میں استعمال ہوتا ہے جیسے مئے آشام، خون آشام

آئینہ رخسار : وہ شخص جس کے گال شیشے کی طرح چمکتے ہوں، آئینے کے سے صاف رخسار رکھنے والا

آنکھ اوجھل : اردو مثل، معمولی سی آڑ بھی پہاڑ کے برابر ہوتی ہے، جو چیز
پہاڑ اوجھل : آنکھ سے پوشیدہ ہو وہ گویا پہاڑ کی اوٹ میں ہے جو چیز آنکھ کے سامنے نہیں وہ اگر قریب بھی ہو پھر بھی دور ہے۔

احتیاج: : حاجت، ضرورت، خواہش

استغفار : بخشش پوچھنا، مرضی پوچھنا، رائے دریافت کرنا

اطباء : طبیب کی جمع، حکیم، وید، دوادارو کرنے والے

اطہار : طاہر کی جمع، پاکیزہ لوگ

التفات : توجہ، مہربانی، رغبت، دھیان

امرِ اولیٰ : پہلا کام

اندیشہ : فکر، سوچ، تردد، خوف کھٹکا

انفعال : شرمندہ ہونا

ائمہ : امام کی جمع، پیشوا، ہادی

ب

بادۂ گلگوں : گلاب کی طرح سرخ رنگ کی شراب

باتوں میں کھولنا : بات چیت سے کسی کے دل کا حال دریافت کرنا

بال باندھا غلام: : نہایت تابع اور فرمان بردار غلام

بانکپن : ٹیڑھا پن، البیلا پن، ناز و ادا، وضع داری، جو خود نمائی کے ساتھ ہے

بزم آرا : مجلس آراستہ کرنے والا، صاحب مجلس، میر مجلس

بزم والا گوہر : بلند مرتبے والی بزم، بڑی شان والی محفل

بشاش : خوش و خرم، مسرور، شگفتہ، تر و تازہ

بطِ مے : شراب کی صراحی

بل نکال لینا : کجی دور کرنا، سزا دینا، سیدھا کرنا

پ

پارسا : متقی، پرہیزگار، نیک، پاک، صالح، اللہ والا
پارسائی : نیکی، پاکی، بھلائی
پائمال زمانہ : زمانے کا روندا ہوا، وقت کا کچلا ہوا
پری زاد : پری کی اولاد، نہایت جمیل، شکیل، خوبصورت نہایت حسین
پری شمائل : پری کی خصلتیں، پری کی عادتیں رکھنے والا
پیامبر : قاصد، ایلچی، سفیر
پیش چلنا : قابو چلنا، کارگر ہونا

ت

تحیّر : حیرانی، تعجب، حیرت، اچنبھا
تراش خراش : بناؤ سنگار، طرز و انداز، قطع و برید
تشفی : تسلی، تسکین، دلجمعی، اطمینان
تلخ کامی : ناکامی، نامرادی
تیغِ ابرو : ابرو کا استعارہ تیغ (تلوار) سے کرتے ہیں

ٹ

ٹکسال : وہ جگہ جہاں سکے ڈھالے جائیں
جبہ سائی : ماتھا رگڑنا، منت سماجت کرنا
جٹی جٹی بھوویں : آبروئے پیوستہ، جرواں بھویں
جھمیلا : جھگڑا، بکھیڑا
چشم خون ریز : خون بہانے والی آنکھ

چہ خوش	:	کیا کہنا ہے، اچھے رہے
چینِ بستر	:	بستر کی سلوٹیں، بستر کی شکنیں
حباب	:	پانی کا بلبلہ
حور طلعت	:	خوبصورت چہرہ

خ

خاک سے پاک	:	ادنی رتبے سے اعلیٰ رتبے پر پہنچنا
خانہ ویرانی	:	گھر کی تباہی، بربادی
ختم مرسلینؐ	:	رسول اللہ، آخری پیغمبر
خجستہ شعار	:	مبارک طریق
خواستگار	:	طلب گار، امیدوار
خوش ادا	:	اچھے ادا رکھنے والا
خوش بیان	:	خوش کلام، خوش تقریر، خوش گفتار
خوش گلو	:	خوش الحاں، سریلا، اچھی آواز والا

د

دام	:	جال، پھندا
دام دے کر خریدنا	:	قیمت ادا کر کے خرید لینا
درانداز	:	درآدمیوں میں لڑائی کرادینے والا، بدگو
دلاور	:	بہادری، شجاعت
دل پذیر	:	مرغوب، دل پسند
دل ستاں	:	دلربا، دل چھین لینے والا، معشوق

دل گذار : دل کو نرم کرنے والا

ر

راحتِ جاں : دل خوش کرنے والا

رخنہ انداز : مزاحمت کرنے والا، خلل انداز

رخِ نکو : خوبصورت چہرہ

رقص طاؤس : مور کا ناچ

رنگ جمانا : اثر ڈالنا، رسوخ پیدا کرنا، قابو کر لینا

روش : مقابل، حریف، ہمسر، مانند

ریشِ ناخن : ناخن کا زخم

ز

زائر : زیارت کرنے والا، حاجی، حج کو جانے والا

س

ساعت سعید : نیک گھڑی، مبارک وقت

سامری : ایک یہودی جادوگر جس نے حضرت موسیٰ کے زمانے میں چاندی سونے کا ایک بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اس کی پرستش کروائی تھی

سِڑی : پاگل، سودای، دیوانہ

سہاگ بہاگ : خوشی کے گیت

ش

شبگر : پچھلی رات کا سفر، پچھلی رات کا

شعبدہ : دھوکا، جادو سے متعلق ہنر یا کھیل

شعلہ رو : دہکتے چہرے والا

شکیب : صبر، تحمل

شونی : غم، ماتم، سوگ

شیوۂ : طریق، طور، ڈھنگ

ص

صلاح کار : متقی، رائے دینے والا، مشیر، ناصح

صیدِ نیم بسمل : وہ جانور جو نیم زخمی ہو

ط

طائر رنگ : رنگ کا طائر سے استعارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ رنگ اُڑ جاتا ہے

طمع : خواہش

ظ

ظل اللہ : خدا کا سایہ، بادشاہ

ع

عرش اعلیٰ : خدا کا عرش

عیسوی اعجاز : حضرت عیسیٰ سے منسوب معجزہ

عشق آفرین : عشق کو پیدا کرنے والا

عمر رفتہ : گزری ہوئی زندگی

عیش خانہ : آرام کی جگہ

ف

فتنہ پرداز : فتنہ اُٹھانے والا

فرزانہ : عاقل، دانا، دانش مند، سمجھ دار

فلاطون : افلاطون، یونان کے ایک بہت بڑے حکیم کا نام، عاقل، دانا

فہیم : عقل مند، دانا

ق

قاصدِ سلیمانی : ہدہد، اس کو مرغ سلیماں بھی کہتے ہیں۔ اسی پرندے نے حضرت سلیمان کو بلقیسِ سبا کا پتہ بتایا تھا اور ان کے حسن کی تعریف کی تھی اور خط پہنچایا تھا۔

قبۂ نور : نور کی کلغی، چھاتیاں

قضائے عمری : وہ نماز جو ہر نماز کے ساتھ گزری ہوئی عمر کی قضا شدہ نمازوں کی عوض پڑھی جائے۔

قلاش : مفلس، غریب، کنگال

قلقل : صراحی یا بوتل سے پانی یا شراب نکلنے کی آواز

قیصر : سلطان، شہنشاہ

ک

کاسہ : کٹورا، پیالہ، بھیک کا ٹھیکرا

کدورت : رنجش، دل کا غبار

کسوٹی : وہ پتھر جس پر سونے کا کس دیکھتے ہیں پرکھ

کنج تنہائی : خلوت، گوشۂ عزلت

کھل کھیلنا : مطلق آزاد ہو جانا

گ

گات : وضع، چھاتیوں کی ہیئت

گردشِ ایام : دنوں کی گردش، بدنصیبی

گردوں : آسماں، چرخ

گریۂ شمع : شمع کے آنسو

گلعذار : پھول جیسے رخساروں والا، لال لال گالوں والا، خوبصورت

گوش زد : وہ بات جو سنی جائے

ل

لٹک : لٹکاؤ، ناز و ادا، لہر

لعل بدخشاں : بدخشاں جو ہندوستان اور خراسان کے درمیان واقع ہے وہاں لعل اور سونے کی کان ہے۔

لن ترانی : حرفِ نفی، تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا، خود ستائی

لوحِ محفوظ : وہ تختی جس پر خدا نے دنیا میں ہونے والے ہر فعل کی نسبت ابتداء سے انتہا تک لکھ رکھی ہے اور کوئی اس میں ردوبدل نہیں کرسکتا۔

م

ماہِ کنعاں : کنعاں کا چاند، حضرت یوسف سے مراد ہے۔

متقی : پرہیزگار، گناہوں سے بچنے والا

محتسب	:	حساب لینے والا، وہ حاکم جو خلاف شرع باتوں کی ممانعت کرے۔ حاکم شرعی، کوتوال
مدام	:	ہمیشہ، دائم، متواتر
مردم دیدہ	:	آنکھ کی پتلی
مردنی چھانا	:	چہرے پر موت کے آثار ظاہر ہونا
مژدۂ جاں فزا	:	دل خوش کرنے والی بشارت، حیرت انگیز خبر، ملن کی خوش خبری
مژدہ وصل	:	ملاقات کی خوش خبری، ملن کی بشارت
مستجاب	:	قبول کیا گیا۔ جواب دیا گیا
مسند آرا	:	مسند کو زینت دینے والا، مسند نشیں
مستعد	:	آمادہ، تیار، موجود، کمر بستہ
مصحف	:	وہ کتاب جس میں رسالے اور صحیفے جمع ہوں، قرآنِ مجید (مجازاً) رخسار معشوق
مصلحت	:	نیک صلاح، اچھا مشورہ، مناسب تجویز
مضطر	:	ضرر رسیدہ، بے تاب، بے قرار
معجز بیان	:	کمال فصاحت و بلاغت سے تقریر کرنے والا، بڑا خوش بیاں
مُل	:	شراب، دارو، بادہ
موجزن	:	ٹھاٹھیں مارنے والا
مورچہ باندھنا	:	خندق کھودنا، مورچہ بندی کرنا

مونس : اُنس رکھنے والا، آرام دینے والا
مے گل فام : سرخ رنگ کی شراب

ن

ناشکیب : بے قرار
نغمہ نے : بانسری کی سریلی آواز
نقدِ جاں : جان جوسب سے بڑی دولت ہے
نکمّا : بے کار، ناکارہ، بے حصرف
نیاز : حاجت، احتیاج، آروز

و

واشربو : اور پیو
وردِ زبان : زبان پر چڑھا ہوا، از بر

ی

یاس : ناامیدی، مایوسی، نراش

فرید پربتی ہمارے ان شعراء کی صف میں آتے ہیں، جنھوں نے اپنی وہبی صلاحیتوں کو مشق، مشاہدہ اور مطالعہ کے توسط سے نکھارا اور سنوارا ہے، وادیٔ کشمیر ہمیشہ سے فطری شاعروں کا مسکن رہی ہے۔ کالی داس جیسا عالمی فنکار اس وادیٔ گل پوش میں پیدا ہوا تھا۔ فرید پربتی نے سنسکرت، فارسی اور اردو کی شعری اور ادبی روایات کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے باطنی تحرک کا حصہ بنا کر اپنی تخلیقات پیش کی ہیں انھوں نے تقریباً سبھی شعری اصناف پر کامیاب طبع آزمائی کی ہے وہ سادہ بیانی (स्वभावोक्ति) اور پیچیدہ بیانی (वक्रोक्ति) دونوں کے رمز آشنا ہیں۔ ان کی شاعری میں خیر، حُسن اور صداقت کی دلآویز تصویریں دستیاب ہیں وہ لفظوں کے انتخاب میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار کثیر المعنویت سے آمیز ہیں۔ کشمیری اَچاریہ آنندوردھن نے اس وصف کو بہت اہمیت دی تھی اسلوب، صنائع بدائع، موزونیت، پیچیدگی اور کیفیت آمیز انبساط کی مساوی موجودگی، دُھون (ध्वनि) کی نور پاشی کرتی ہے۔ یہ خصوصیت فرید پربتی کی تخلیقات میں نمایاں طور پر دستیاب ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی خارجی نظریہ یا دبستان کی پیروی نہ کرتے ہوئے اپنی باطنی تحریک کے پاس دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تخلیقات کا محاکمہ شاعری کی آفاقی قدروں اور خصوصیات کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔

عنبر بہرائچی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

81-8223-285-6